اشاعت کا ۹۶ واں سال

زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا ترجمان

نیا دور

دسمبر ۲۰۱۸ء

۱۵ روپے

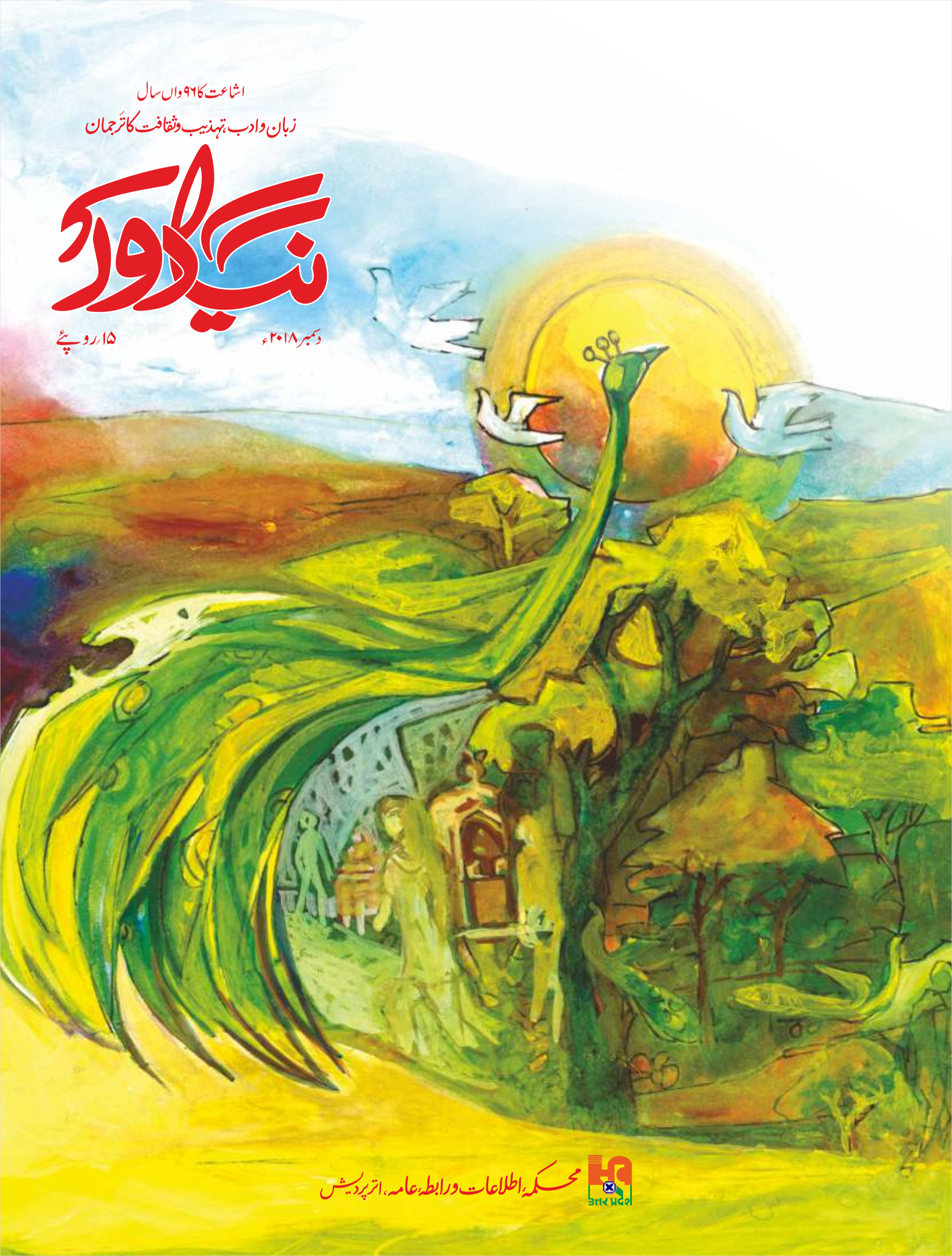

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (دسمبر)

اوپندر ناتھ اشک

مولانا عبدالمجید سالک

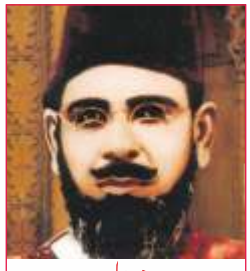
مولانا محمد علی جوہر

انتظار حسین

ڈپٹی نذیر احمد

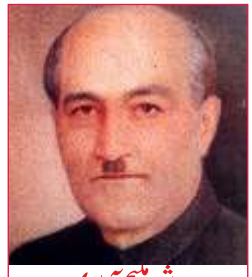
جوش ملیح آبادی

انور سدید

مخمور سعیدی

اسداللہ خاں غالب

خواجہ حسن نظامی

رشید احمد صدیقی

خلیق انجم

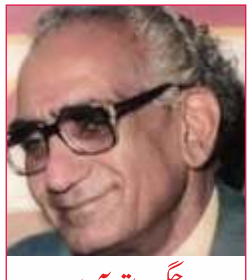
جگن ناتھ آزاد

ساغر نظامی

جون ایلیا

انور سدید	۴؍دسمبر ۱۹۲۸ء	۲۰؍مارچ ۲۰۱۶ء
جوش ملیح آبادی	۵؍دسمبر ۱۸۹۸ء	۲۲؍فروری ۱۹۸۲ء
قیوم خضر	۶؍دسمبر ۱۹۲۴ء	۱۲؍مارچ ۱۹۹۸ء
ڈپٹی نذیر احمد	۶؍دسمبر ۱۸۳۶ء	۳؍مئی ۱۹۱۲ء
محی الدین قادری زور	۶؍دسمبر ۱۹۰۴ء	۲۵؍ستمبر ۱۹۶۲ء
حمید الماس	۷؍دسمبر ۱۹۳۵ء	۱۶؍جولائی ۲۰۰۲ء
انتظار حسین	۷؍دسمبر ۱۹۲۳ء	۲؍فروری ۲۰۱۶ء
ناصر کاظمی	۸؍دسمبر ۱۹۲۵ء	۴؍مارچ ۱۹۷۴ء
سر تیج بہادر سپرو	۸؍دسمبر ۱۸۷۵ء	۲۰؍جنوری ۱۹۴۹ء
امتیاز علی عرشی	۸؍دسمبر ۱۹۰۴ء	۲۱؍فروری ۱۹۸۱ء
صغریٰ مہدی	۸؍دسمبر ۱۹۳۹ء	۱۷؍مارچ ۲۰۱۴ء

محسن الملک	۹؍دسمبر ۱۸۳۷ء	۱۶؍اکتوبر ۱۹۰۷ء
مولانا محمد علی جوہر	۱۰؍دسمبر ۱۸۷۸ء	۴؍جنوری ۱۹۳۱ء
آزردہ دہلوی	۱۲؍دسمبر ۱۷۸۹ء	۱۶؍جولائی ۱۸۶۸ء
برج موہن دتاتریہ کیفی	۱۳؍دسمبر ۱۸۶۶ء	یکم نومبر ۱۹۵۵ء
مولانا عبدالمجید سالک	۱۳؍دسمبر ۱۸۹۴ء	۲۷؍ستمبر ۱۹۵۹ء
اوپیندر ناتھ اشک	۱۴؍دسمبر ۱۹۱۰ء	۱۸؍جنوری ۱۹۹۶ء
جون ایلیا	۱۴؍دسمبر ۱۹۱۰ء	۸؍نومبر ۲۰۰۲ء
جگن ناتھ آزاد	۱۵؍دسمبر ۱۹۱۸ء	۲۴؍جولائی ۲۰۰۴ء
سالک لکھنوی	۱۶؍دسمبر ۱۹۱۳ء	۴؍جنوری ۲۰۱۳ء
ساغر نظامی	۲۱؍دسمبر ۱۹۰۵ء	۲۱؍فروری ۱۹۸۴ء
خلیق انجم	۲۲؍دسمبر ۱۹۳۵ء	۱۸؍اکتوبر ۲۰۱۶ء

مالک رام	۲۲؍دسمبر ۱۹۰۶ء	۱۶؍اپریل ۱۹۹۳ء
قدسیہ زیدی	۲۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء	۱۹۶۰ء
رشید احمد صدیقی	۲۴؍دسمبر ۱۸۹۲ء	۱۵؍جنوری ۱۹۷۷ء
مشیر جھنجھانوی	۲۴؍دسمبر ۱۹۲۶ء	۲۱؍مارچ ۱۹۹۰ء
خواجہ حسن نظامی	۲۵؍دسمبر ۱۸۷۸ء	۳۱؍جولائی ۱۹۵۵ء
صہبا لکھنوی	۲۵؍دسمبر ۱۹۱۹ء	۳۱؍مارچ ۲۰۰۲ء
خلیق احمد نظامی	۲۵؍دسمبر ۱۹۲۵ء	۵؍دسمبر ۱۹۹۷ء
شمیم فاروقی	۲۵؍دسمبر ۱۹۴۳ء	۲۹؍اگست ۲۰۱۴ء
اسداللہ خاں غالب	۲۷؍دسمبر ۱۷۹۷ء	۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء
حنیف نقوی	۲۹؍دسمبر ۱۹۳۸ء	۲۲؍دسمبر ۲۰۱۲ء
مخمور سعیدی	۳۱؍دسمبر ۱۹۳۴ء	۲؍مارچ ۲۰۱۰ء

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۳ شمارہ : ۸

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

دسمبر ۲۰۱۸ء

پبلشر: ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

شرینواس ترپاٹھی، غزال ضیغم

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

کور: ایس.آر.جائسوال

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ — اپنی بات ۲

مضامین

سودا کا قصیدہ 'تضحیک روزگار' — علی عمران عثمانی ۳

ذوق کی قصیدہ نگاری — امیر حمزہ ۱۰

امیر مینائی کی قصیدہ نگاری — محمد ارشد ۱۳

محسن کاکوروی کی قصیدہ نگاری — اسلم مرتضیٰ ۱۶

تدریس قصیدہ کی مبادیات — حنا آفریں ۲۰

اردو قصیدہ نگاری؛ ایک اجمالی جائزہ — ڈاکٹر زیبا محمود ۲۳

اشعار میں رجحان تو ارد — کرشن بھاؤک ۲۶

افسانے

ورثہ — زنیرہ ۴۰

کھنڈر سے آتی آوازیں — حنیف خان ۴۲

غزلیں

غزلیں — سلمان عابدی، کوثر سلطانپوری ۴۸

غزلیں — راز ساغری، عمران راقم ۴۹

غزلیں — روشن لال روشن، مدہوش بلگرامی ۵۰

غزلیں — حیرت فرخ آبادی، شاداں سلطانپوری ۵۱

غزلیں — کوثر صدیقی، راز اعظمی ۵۲

غزلیں — طلحہ تابش، اشفاق نجمی ۵۳

رپورتاژ

ایک یادگار جشن — ڈاکٹر ریشماں پروین ۵۴

تبصرہ

کوئی میرے دل سے پوچھے (نیاز سلطانپوری) — موسیٰ رضا ۶۳

مراسلات

خطوط — ادارہ ۶۴

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

دسمبر کا شمارہ پیش خدمت ہے اس شمارہ میں سات مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔ ابتدائی چھ مضامین اردو قصائد پر ہیں۔قصیدہ ہمارے ادب کی اہم ترین اصناف سخن میں ہے جسے ایک زمانے میں تمام اصناف سخن پر فوقیت حاصل تھی۔ اردو میں قصیدہ فارسی زبان سے آیا اور شروع میں قصائد عام طور پر فارسی میں ہی لکھے جاتے تھے غالب کے کئی قصائد فارسی میں ہیں۔ایک زمانے تک فارسی دربار کی زبان رہی ہے لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ قصیدے اردو میں لکھے جانے لگے ان قصائد میں ایک بڑی تعداد ان قصائد کی ہے جو بادشاہوں اور امراء کی مدح وستائش میں نظم کئے گئے اس کے علاوہ مدحیہ قصائد کی ایک قسم نعتیہ ومنقبتی قصائد کی ہے۔ دربار تو اب نہیں رہے لیکن نعتیہ ومنقبتی قصائد اب بھی بڑی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں اس طرح آج بھی یہ ایک زندہ صنف سخن ہے۔قصیدہ پر ان مضامین کی حیثیت ایک گوشے کی ہے جس میں قصائد،قصیدہ نگاری کے فن اور قصیدہ نگاروں پر گفتگو کی گئی ہے مثلاً علی عمران عثمانی کا مضمون سوداؔ کی قصیدہ نگاری اور خاص طور پر ہجو میں ان کی فنکاری اور صناعی سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا مضمون شیخ ابراہیم ذوق کی قصیدہ نگاری سے تعلق رکھتا ہے جسے امیر حمزہ نے تحریر کیا ہے۔امیر مینائی کی قصیدہ نگاری کا محمد ارشد نے جائزہ لیا ہے اور محسن کاکوروی کی قصیدہ نگاری کا تجزیہ اسلم مرتضیٰ نے کیا ہے۔حنا آفرین کا مضمون قصیدے کی مبادیات سے تعلق رکھتا ہے اور زیا محمود نے اردو قصیدہ نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔اس طرح ہم نے قصیدے کی تنقید وتاریخ سے لے کر اس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ہم اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے یہ ہمیں آپ کے خطوط سے معلوم ہوگا۔

ساتواں مضمون شاعری میں توارد کے دل چسپ موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔کرشن بھاوک نے تفصیل سے اردو شاعری میں توارد کے مسئلہ کا جائزہ لیا ہے۔ اردو شاعری میں یہ مسئلہ آج کوئی نیا نہیں ہے۔اس سلسلہ میں بہت سے لوگوں پر سرقے کا الزام آیا لیکن واقعتاً کیا اسے سرقہ کہا جانا چاہئے یا وہ صرف توارد کی حد میں آتا ہے۔ اردو شاعری میں قافیہ اور ردیف کی پابندی کی وجہ سے اس طرح کا توارد کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ قافیہ کے ساتھ اسکا معنوی پس منظر اور اس کے ساتھ آنے والا خیال یکساں ہوجانا فطری بات ہے۔ بہر حال یہ ایک اہم موضوع ہے اور مجھے امید ہے کہ قارئین بھی اس گفتگو میں حصہ لیں گے ہم ان کی آراء کو برابر شائع کرتے رہیں گے۔لکھنؤ اپنے تہذیب وتمدن میں سارے ملک میں اہم تھا اور آج بھی اس کی اہمیت باقی ہے۔ہم گزشتہ لکھنؤ کی تہذیبی اقدار کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔کبھی کبھی ان چیزوں کو یاد کرتے رہنا اور یاد دلانا بھی ایک بڑا کام ہے۔ اس سلسلہ میں ہم قدیم لکھنؤ کی ایک بڑی تاریخی شخصیت پر مرزا جعفر حسین کا مضمون 'منشی نول کشور' شائع کر رہے ہیں۔اس بار ہم کئی غزلیں پیش کر رہے ہیں۔غزل ہماری شاعری کی مقبول صنف سخن ہے۔ اس میں آپ کو جدید و قدیم دونوں رنگ ملیں گے۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال
فیس بک اور واٹس اپ پر
قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں

اس شمارے میں ایک نیا موضوع 'رپورتاژ' کا شامل ہے۔اس میں لکھنو میں منعقدہ 'جشن شارب' کے سہ روزہ چشم دید حالات کو ڈاکٹر ریشما پروین نے پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ تمام مشمولات آپ کو پسند آئیں گے۔

دسمبر 2018 جاتے جاتے ہمیں بعض بہت بڑی شخصیتوں سے محروم کر گیا جو ہماری ادبی وثقافتی دنیا کا اہم حصہ تھے۔12 دسمبر کو مشہور ادیب، ناقد، شاعر، افسانہ نگار اور کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حامدی کاشمیری کا 86 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ کشمیری زبان کے بھی ادیب تھے۔انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کیا تھا وہ پروفیسر وصدر شعبہ کی حیثیت سے رٹائر ہوئے۔ انھوں نے اپنی علمی وراثت کے طور پر تقریباً 50 کتابیں چھوڑیں، وہ اکتشافی تنقید کے بنیاد گزار ناقد تھے۔غالب ایوارڈ کے علاوہ ان کی خدمات کے اعتراف میں دوسرے بہت سے ایوارڈ سے انھیں نوازا جا چکا ہے۔ انھوں نے جو علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔

مشہور مورخ اور دانشور، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، سابق ڈائرکٹر نیشنل آرکائیوز پدم شری پروفیسر مشیر الحسن کا 10 دسمبر کو 69 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔وہ بے حد ملنسار اور خوش مزاج انسان تھے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا اس موقع پر سابق نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری، سابق وائس چانسلر شاہد مہدی، جناب نجیب جنگ، جامعہ خاندان اور شہر کے معزز حضرات موجود تھے۔انھوں نے جنوبی ایشیا اور تقسیم ہند میں اسلام کی تاریخ اور اودھ کے قصبات پر بڑا قابل قدر کام انجام دیا جس کے لئے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

استاد الشعرا سید مرغوب الدین کاظمی کا سہارنپور میں 17 دسمبر کو 85 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا وہ ایک عرصے سے جامعہ غوثیہ رضویہ سے متعلق تھے اور وہیں مقیم تھے ان کے ورثا میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی وراثت میں دو مجموعے، وجہ کن فکان اور روح مناقب کے علاوہ علامہ خاکی کی سوانح قطب درفشاں کے نام سے چھوڑی مرحوم انتہائی نیک اور سادہ مزاج انسان تھے۔

معروف شاعر مولانا سید عبدالعزیز ظفر جنگ پوری کا 31 دسمبر کو 107 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا مرحوم ایک کہنہ مشق اور مشہور شاعر تھے انھیں نعت گوئی سے بے حد دلچسپی تھی تدفین حضرت نظام الدین کے قبرستان میں تمام احباب واعزا کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ ادارہ ان تمام حضرات کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کی مغفرت کے لئے دست بہ دعا ہے۔ مجھے حسب معمول اس شمارے کے بارے میں بھی آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ایک بات:

اردو ہمارے ملک کی ایک قومی زبان ہے اور یہ ہماری تہذیبی وادبی شناخت بھی ہے بقول احمد وصی:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیجئے کہ یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ضرورت بھی۔

سودا کا قصیدہ 'تضحیک روزگار'

علی عمران عثمانی

اسسٹنٹ پروفیسر
ویمنس کالج، اے.ایم.یو علی گڑھ
رابطہ: 9808152499

کلیات سوداؔ کے اکثر مطبوعہ نسخوں میں اس ہجو یہ قصیدہ کا عنوان ''قصیدہ در ہجو اسپ المسمّٰی بہ تضحیکِ روزگار'' ہے۔لیکن بعض قلمی نسخوں میں اس عنوان میں یہ بھی اضافہ ہے ''وراکبش سلمہ اللہ تعالیٰ'' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہجو میں سوداؔ نے جس شخص کے گھوڑے کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے وہ محض فرضی اور خیالی نہیں ہے بلکہ گھوڑے والا کوئی شخص واقعی موجود تھا، نیز یہ کہ لفظ ''سلمہ اللہ تعالیٰ'' سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جس وقت سوداؔ نے یہ ہجو لکھی اس وقت اس اسپ نابکار کا مالک بقید حیات تھا اور اگر یہ فرضی نہیں تو یہ شخص، عمر میں سوداؔ سے چھوٹا بھی تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ آخر وہ شخص کون تھا، جس کے گھوڑے کا ایسا خط و خال سوداؔ نے واضح کیا ہے۔

زیرِ نظر ہجو یہ قصیدہ سوداؔ نے انوریؔ کے اس مدحیہ قصیدہ کی تقلید میں لکھا ہے، جس کی تشبیب میں انوریؔ نے کسی گھوڑے کی ہجو کی ہے۔لیکن سوداؔ نے ۱۸۱ اشعار کا پورا قصیدہ ایک گھوڑے کی ہجو میں لکھ ڈالا۔انوریؔ کے اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

وی بامداد عید کہ برصدرِ روزگار
ہر روز عید باد بہ تائید کردگار

اس ہجو یہ قصیدہ کے متعلق اکثر ناقدین کی یہ رائے ہے کہ یہ سوداؔ کا معرکہ آرا ہجو یہ قصیدہ ہے۔اس قصیدہ میں ایک معیاری ہجو کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔علمائے فن نے ہجو کے لیے کچھ معیار مقرر کیے ہیں، جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ایک معیاری ہجو کی خوبی یہ ہے کہ سب سے پہلے اس میں شوخی اور ظرافت ہو، دوسرے ایسے عیوب اور کمزوریاں دکھائی جائیں جن کو پڑھنے والا بے تامل تسلیم کر لے، تیسرے ہر عیب کو اشارہ اور کنایہ کے پیرائے میں بیان کیا جائے، چوتھے اگر تفصیل سے کام لیا بھی جائے تو قوت متخیلہ سے ایسے نئے نئے پہلو نکالے جائیں کہ ہجو طوالت کی وجہ سے گراں نہ گزرے بلکہ بلیغ معلوم ہو، مبالغہ جو بعید از فطرت ہو وہ عام شاعری میں نامناسب ہے لیکن مدحیہ و ہجو یہ شاعری میں مستحسن ہے، کیونکہ ہجو یہ شاعری میں اس سے قاری کے لیے ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ان معیاروں پر اگر ہم سوداؔ کی اس ہجو کو پرکھیں تو ہمیں یہ ایک معیاری ہجو معلوم ہوتی ہے۔

سوداؔ نے اپنی اس ہجو میں ساری قوت اور شاعرانہ توانائی صرف کردی ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ سوداؔ نے صرف ایک ہجویہ قصیدہ لکھا ہے اور وہ ہے ''تضحیکِ روزگار''۔ اس قصیدے کی بنیاد پر اسے اردو کا انوری کہا جاسکتا ہے۔ اس قصیدہ کا ایک ایک فقرہ طنزیہ ہے ۔قصیدے میں یوں تو ایک گھوڑے کی ہجو ہے مگر اس کے پردے میں مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر عسکری نظام کی ترجمانی کی گئی ہے۔''۱؎

اس قصیدہ کی ستائش میر تقی میرؔ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''دوراز حد مقدور، وصنعتہا بکار بردہ'' ۲؎

شیخ چاند اس قصیدہ کے تمثیلی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قصیدہ ''تضحیکِ روزگار'' میں بظاہر ایک گھوڑے کی ہجو ہے، لیکن یہ دراصل فوجی نظام کی خرابی کا مرثیہ ہے۔ ناکارہ اور نکمے سپاہیوں کے برے ہڈرے، علف ودانہ کا موجود وفراہم نہ ہونا، اور مہینوں تنخواہ کا نہ ملنا، یہ سب اس میں مذکور ہے''۔ ۳؎

خود سوداؔ نے بھی اس قصیدہ میں اعتراف کیا ہے کہ زمانے کی برائی کے بیان میں ہی یہ قصیدہ میں نے لکھا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام بھی ''تضحیک روزگار'' رکھا ہے، جیسا کہ اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے:

سوداؔ نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدہ کا ''تضحیک روزگار''

قصیدہ کا مطلع اور اس کی تمہید سے ہی زمانے کی بدحالی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ابھر آتا ہے۔ اس کی تمہید کے متعلق شیخ چاند لکھتے ہیں:

''اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ زمانے کی حالت دگرگوں ہے، جن کے طویلے میں عربی اور عراقی گھوڑے بندھے رہتے تھے، آج وہ اس قدر مفلس ہوگئے ہیں کہ اپنی جوتی ادھار پڑ گٹھواتے ہیں۔ بعض لوگ مالدار بھی ہیں مگر انتہائی درجے کے کنجوس ہیں۔ ان میں ہمارے ایک دوست بھی ہیں جو سو روپے تنخواہ پاتے ہیں، ایک گھوڑا رکھ چھوڑا ہے، جس کو دانہ گھاس میسر نہیں ہے ،اور نہ اس کے لئے کوئی سائیس ہے''۔ ۴؎

اس ہجویہ قصیدہ کی تمہید میں شاعر ایسے لوگوں کی بدحالی اور ابتری کا بیان کرتا ہے جو تھوڑے دنوں قبل ہی بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے، یہاں تک کہ ان کے طویلے اور اصطبل میں عراقی وعربی گھوڑے بے شمار تھے۔ قدیم دور میں گھوڑا رکھنا متمول ہونے کی علامت تھی، وہ بھی عراقی وعربی نسل کا گھوڑا، اور ایک دو گھوڑے نہیں بلکہ بے شمار گھوڑے۔ یہ معاملہ بالکل اسی طرح کا ہے جیسے موجودہ دور میں سب سے قیمتی غیر ملکی موٹر اور کاریں کسی کے پاس موجود ہوں، اور ایک دو نہیں بلکہ لاتعداد کاریں ہوں، تو اس سے اس شخص کے دولتمند اور متمول ہونے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہرحال شاعر ایسے دولتمندوں کا حال بیان کرتا ہے کہ زمانے کے ظلم وستم نے ان کا یہ حال بنادیا ہے کہ جب ان کی جوتی ٹوٹ جاتی ہے تو موچی سے اس کو بھی ادھار ہی گٹھواتے ہیں۔ اول تو جوتی کے ٹوٹ جانے پر نئی جوتی کا نہ خرید پانا غربت کی علامت ہے ہی، اور پھر اس ٹوٹی ہوئی جوتی کو ادھار گٹھوانا کس قدر ذلت آمیز غربت کا مظاہرہ کرتی ہے جبکہ جوتی گٹھوانے میں معمولی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اتنے کم پیسے بھی موصوف کے پاس نہیں ہیں۔ در اصل سوداؔ نے ان تین اشعار میں اس زوال آمادہ دور کا نقشہ کھینچ دیا ہے، جس سے اس دور میں ہر کس وناکس دو چار تھا۔

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے
ہر گز عراقی وعربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

(ابلق عربی میں چتکبرے گھوڑے کو کہتے ہیں، ابلق ایام شاعر نے اس رعایت سے استعمال کیا ہے کہ زمانہ دن اور رات کی شکل میں سیاہ وسفید رنگ کے گھوڑے پر سوار ہے، ابلق دن رات کی رعایت ہے)

اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ اس دور افلاس وغربت میں صرف امیروں کا ہی وہ حال نہیں ہے جو ابھی گزرا، بلکہ اکثر لوگ ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ افلاس وتنگ دستی نے لوگوں کو اور بھی بخیل بنادیا ہے۔ پھر شاعر اپنے ایک دوست کا حال بیان کرتا ہے کہ وہ اچھی خاصی خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں، سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر نوکری کرتے ہیں، لیکن ایک گھوڑا پال رکھا ہے جس کو کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں دیتے، جس کی وجہ سے وہ نہایت ہی کمزور وناتواں اور ذلیل ہوگیا ہے، نہ تو اس گھوڑے کے لیے دانہ کا انتظام ہے اور نہ ہی گھاس کا، میرے دوست کی ملکیت میں وہ گھوڑا ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ جیسے کوئی شیر خوار بچہ مٹی کا گھوڑا، بطور کھلونے کے رکھتا ہو:

تنہا ولے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خسّت سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو، اتنا ذلیل وخوار
نے دانہ ونہ کاہ، نہ تیمار، نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپِ گلی، طفلِ شیر خوار

سوداؔ کو گھوڑے کے خط وخال واضح کرنے میں جو مہارت حاصل ہے، اس کا انداز مدحیہ قصائد کے مطالعے میں گھوڑے کی برق رفتاری، اس کی خوبصورتی

اور چالاکی وغیرہ کے بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ اب ہجویہ قصائد میں اس کی متضاد کیفیت کی شاعر کس طرح وضاحت کرتا ہے، چنانچہ ایک اچھے اور توانا گھوڑے کے مقابلے میں برے اور کمزور گھوڑے کا ذکر اور اس کی تضحیک بھی سودا کیسی چابک دستی سے بیان کرتا ہے۔ گھوڑے کی ناطاقتی، لاغری اور فاقہ کشی کے متعلق شاعر کیسی تصویر کھینچتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس گھوڑے پر صرف ایک دو شام کا فاقہ نہیں ہے، بلکہ اس کے فاقوں کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ کمزوری کا یہ حال ہے کہ نقش نعل کی طرح وہ نظر نہیں آتا، اور اگر زمین پر ایک مرتبہ بیٹھ جائے تو اس کا اٹھنا محال ہے۔ پھر شاعر اس کے بھوک کی کیفیت بیان کرتا ہے کہ وہ گھوڑا بھوک کے مارے اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ جب راکب اس کو لے کر کسی بازار سے گزرتا ہے تو قصاب وغیرہ گوشت اور کھال کے لیے امیدوار بن جاتے ہیں۔ پھر شاعر اس گھوڑے کے مالک کو قصائی گردانتے ہوئے کہتا ہے کہ جب سے یہ گھوڑا اس کی ملکیت میں آیا ہے، مالک کی زیادتی اور ظلم کی وجہ سے گھوڑے کا یہ حال ہوگیا ہے کہ جب رات کو اسے آسمان کے ستارے نظر آتے ہیں تو انہیں دانہ سمجھ کر آسمان کی طرف کھانے کے لئے بے قرار ہوکر دیکھنے لگتا ہے، اور سورج کی شعاعوں کو وہ گھاس کا دستہ یعنی کھیت سمجھ کر، دن بھر اپنا جسم زمین پر پٹکتا رہتا ہے۔ اگر کہیں تنکا پڑا ہوا دیکھتا ہے تو زمین سے اس طرح چمٹ جاتا ہے کہ وہاں سے ہلتا ہی نہیں ہے۔ جب وہ توبڑا اور تھان کی طرف دیکھتا ہے تو اس قدر زمین پر اپنی ٹاپوں کو مارتا ہے کہ زمین کنویں کی طرح کھد جاتی ہے۔ فاقوں کی وجہ سے اس میں ہنہنانے کی طاقت باقی نہیں رہی اور گھوڑی کو دیکھ کر اس کا ریح خارج ہونے لگتا ہے۔ وہ کمزوری کی وجہ سے اس قدر ہلکا اور دبلا ہوگیا ہے کہ اگر اس کو مضبوطی سے تھان سے نہ باندھا جائے تو ہوا اسے اڑا کر لے جائے۔ نہ تو اس کے جسم میں گوشت اور ہڈیاں ہی ہیں اور نہ ہی اس کے پیٹ میں کچھ موجود ہے اس لیے جب وہ سانس لیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوہار اپنے کہال (بھٹی) کو دھونک رہا ہو۔ پھر شاعر مبالغہ میں اور اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بات جھوٹ نہیں کہ اگر نسیم اس کے جسم کو چھو جائے تو وہ بادسموم بن جائے۔ نسیم صبح کی ٹھنڈی ہوا ہوتی ہے اور سموم زہریلی یعنی دوپہر کی لُو بھری گرم ہوا۔ اس کے جسم پر خارش کی وجہ سے اس قدر زخم ہوگئے ہیں کہ ہے تو وہ ابلق لیکن سرنگ معلوم ہوتا ہے، سرنگ سرمئی یا لال رنگ کو کہتے ہیں جو زخم کا رنگ ہوتا ہے، یعنی اس گھوڑے کو اب پہچاننا مشکل ہے، زخموں کی کثرت و سرخی کی وجہ سے اس کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ اور اس کے زخموں پر اس قدر مکھیاں لپٹی ہوتی ہیں کہ اس کا رنگ نہ تو ابلق رہا اور نہ سرنگ ہے بلکہ مگسی، یعنی مکھیوں کا رنگ ہوگیا ہے:

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار
قصاب پوچھتا ہے، مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں، کہتے ہیں یوں چمار
جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گزرے ہے اس نمط اسے، ہر لیل و ہر نہار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہوکے بے قرار
خط شعاع کو وہ سمجھ، دستۂ گیاہ
ہر دن زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار
تنکا اگر کہیں پڑا دیکھے ہے گھاس کا
چوگنے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے منھ پسار
دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنویں، ٹاپیں مار مار
فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار
نے استخواں، نہ گوشت، نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے، کہ جوں کہال کو لہار
پیدا ہوئی ہے تس پہ اگن باد، اس قدر
ہرگز دروغ اس کو تو مت جان! زینہار
گزرے وہ جس طرف سے، کبھو اس طرف نسیم
بادسموم ہووے وویں، گر کرے گزار
سمجھا نہ جاوے یہ، کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبس، کہ ہے مجروح بے شمار
ہر زخم پر زبس کہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی، اس اعتبار

اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ اس گھوڑے کی اس درجہ ابتر حالت کو دیکھ کر لوگ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے خدا اس موذی مالک کے چنگل سے تو اس بے زبان جانور کو جلد آزاد کر دے، یا تو یہ گھوڑا چوری ہوجائے یا کھو جائے یا پھر مر ہی جائے، لیکن اے خدا تینوں امور میں سے تو کسی امر کو جلد ظاہر کر دے۔ پھر شاعر کہتا ہے کہ اس غم سے صرف میرا دل ہی تنگ زین کی طرح بوجھل نہیں ہے بلکہ خوگیر، جو کہ زین کے نیچے کا کپڑا اور نمدہ ہوتا ہے، اس کا بھی سینہ اسی غم سے زخمی ہوگیا ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے اور اس گھوڑے کے مالک کے درمیان جو معاملہ پیش آیا تھا، اس کا بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ واقعہ ہے کہ شومئ قسمت سے اس گھوڑے کے مالک جو میرے دوست بھی تھے، میرے قریب ہی رہا کرتے تھے، مجھے کوئی ضروری کام آپڑا، سوچا کہ ان سے گھوڑا مانگ لوں، جب میں نے ان کی خدمت میں جاکر ان سے گھوڑا مستعار مانگا تو انھوں نے فرمایا کہ اے مہربانِ من، میرا بس چلے تو ایسے ہزار گھوڑے آپ کی خدمت

میں پیش کردوں ،لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ گھوڑا کسی کے چڑھنے کے قابل ہی نہیں ہے ۔اس کے بعد سوداؔ اس گھوڑے کے مالک ہی کی زبان سے اس کی برائی بیان کرواتا ہے،سوداؔ کی یہ تکنیک زیادہ اثر آفریں ہے کہ وہ مکالمے کی صورت میں اور واقعات کے بیان کرنے کے ضمن میں اس اسپِ نابکار کی تضحیک اور ہجو کرتا ہے۔ چنانچہ گھوڑے کا مالک بار بار اپنے بیان کے درمیان سوداؔ کو یہ یقین دلاتا ہے کہ میں کوئی بہانہ نہیں کر رہا ہوں ، واقعی یہی بات ہے کہ وہ گھوڑا ایسا ہی ہے ۔ اس گھوڑے کی تفصیل پھر اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اس کی صورت ایسی بری ہے کہ اس کو دیکھ کر گدھا شرما جائے اور سیرت اور خصلت میں اس کا وہ برا حال ہے کہ سگِ خشم گیں یعنی غصے سے بھرہوا کتا بھی اس کو دیکھ کر عار محسوس کرنے لگے ۔ اس کا جسم ایسا بدرنگ ہے کہ جیسی لید ہوتی ہے،اور اس کے جسم سے پیشاب جیسی بدبو آتی ہے،اور وہ بدیمن یعنی نامبارک اور منحوس ایسا ہے کہ اگر اس کو ہزار اصطبلوں میں بھی باندھا جائے تو بھی اجڑ جائیں ۔ جب وہ تھان پر ہوتا ہے تو میخ چو، یعنی میخ ٹھونکنے والے مگدر کی طرح لکدزن ،یعنی لاتیں مارتا ہے ، اور جب وہ سواری کے لیے لایا جاتا ہے تو استوار میخ کی طرح لاجب یعنی بے حرکت اور ساکت ہوجاتا ہے ، اگلے شعر میں شاعر نے لفظ حشرئ سے ایہام کا کام لیا ہے۔لفظ حشرئ گھوڑے کے عیوب میں سے ایک عیب ہے یعنی بے جوڑ گھوڑا ، اس عیب کی طرف اشارہ کر کے شاعر کہتا ہے کہ وہ ایسا ذلیل اور حشرئ گھوڑا ہے کہ قربِ قیامت میں دجّال اپنے منھ کو کالا کر کے اس پر سوار ہو کر نکلے گا۔ جب وہ چلتا ہے تو اپنے سر کو اتنا جھکا کر چلتا ہے کہ کوئی سامنے کی چیز اس کو دکھائی ہی نہیں دیتی ہے ۔ اس لیے اس کے منھ اور جبڑوں پر چلنے کے دوران کچھ زیادہ ہی ٹھوکریں لگتی ہیں جس کی وجہ سے اس کے تمام دانت جھڑ گئے ہیں ۔ وہ اس قدر بوڑھا ہوگیا ہے کہ جو اس کی عمر بتلائے اسے پہلے ریگستان کے ذرات کو گننا پڑے گا ، یعنی ریگستان میں ریت کے جتنے ذرات ہیں ان کی تعداد سے زیادہ اس گھوڑے کی عمر ہے ۔لیکن تاریخ کی رو سے جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ جب شیطان کو حکم عدولی کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا تھا تو اسی گھوڑے پر سوار ہوکر شیطان جنت سے نکلا تھا ، یعنی اس کی عمر اتنی زیادہ ہوچکی ہے:

یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کے تو چھڑا اس کو ، کردگار
لے جاوے چور ، یا مرے ، یا ہو کہیں یہ گم
اس تین بات سے ، کوئی بھی ہووے آشکار
تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ ،تنگِ زین
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا ، تو ہے فگار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جایئے ، گھوڑے پہ ہو سوار
رہتے تھے گھر کے پاس ، قضا را، وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے ، وہ اسپ نابکار
خدمت میں ان کی ، میں نے کیا جا کے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار
فرمایا تب انھوں نے کہ ، اے مہربانِ من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن ،کسو کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے ، اس کو نہ جانو گے انکسار
صورت کا جس کی دیکھنا ، ہے گا گدھے کو ننگ
سیرت سے جس کی نت ، سگِ خشم گیں کو عار
بدرنگ جیسے لید ہے ، بدبو ہے جوں پیشاب
بد یمن یہ ، کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار
مانند میخ چوکے ، لکد زن ہے تھان پر
لاجب وہ زمیں سے ہے ، جوں میخ استوار
حشرئ ہے اس قدر کہ بہ حشر اس کی پشت پر
دجّال ، اپنے منھ کو سیہ کر کے ہوسوار
اتنا وہ سرنگوں ہے ، کہ سب اڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار
ہے پیراس قدر ، کہ جو بتلا وے اس کا سن
پہلے ، وہ لے کے ریگ بیاباں ، کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطان اسی پہ ، نکلا تھا ، جنت سے ہوسوار

مدحیہ قصائد میں اکثر جگہ سوداؔ نے گھوڑے کی برق رفتاری کا بیان بڑے ہی انوکھے انداز میں کیا ہے، یہاں ایک گھوڑے کی سست رفتاری کو کس مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے،اس کی سستی کو بیان کرنے کے لیے کیسے کیسے خیالات نظم کیے گئے ہیں۔تخیل کی یہ نادرہ کاری سوداؔ کے یہاں تقریباً ہر جگہ ہی موجود ہے، چاہے وہ مدحیہ قصائد ہوں یا ہجویہ قصیدے۔شاعر گھوڑے کی سست رفتاری کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ گھوڑا اتنا کم رو اور سست رفتار ہے کہ اگر اس کے نعل کا لوہا گلا کر لوہار تلوار بنائے تو میدان جنگ میں وہ تلوار رستم جیسے بہادر پہلوان سے بھی نہیں چل سکتی ، یعنی اس گھوڑے کی سستی کا اثر اس کے نعل میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ پھر شاعر کہتا ہے کہ جس طرح سے شطرنج کا گھوڑا بغیر کسی دوسرے کی مدد کے چلتا اور ہلتا تک نہیں ہے، وہی حالت اس گھوڑے کی بھی ہے ۔گھوڑے کی کم روی کی اگلی مثال سوداؔ نے یہ دی ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اس گھوڑے کو مانگ کر برات میں لے گیا تھا ، جب دولہا کو اس پر سوار کر کے لے جایا گیا تو اس نوشاہ کا یہ حال ہوا کہ جب وہ گھر سے چلا تھا تو اس کے رخسار پر سبزہ بھی نہیں اگا تھا (سبزہ خط کے وہ بال ہیں جو چہرے پر سب سے پہلے نمودار ہوتے ہیں) پہلے تو اس کے رخسار پر سبزہ نکلا، پھر وہ سبزہ سیاہ ہوگیا یہاں تک کہ اس کی کالی داڑھی بھی سفید ہوگئی ،اور جو اس کا سرو جیسا قد تھا وہ شاخِ باردار بن گیا یعنی اس کی کمر جھک گئی ۔ غرض کہ اس گھوڑے پر سوار ہوکر دلہن کے گھر تک پہنچتے پہنچتے نوشاہ کو اتنا زیادہ وقت لگ گیا کہ وہ بوڑھا ہوگیا:

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا

لوہا گلا کے تیغ بنا وے کوئی لہار
ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار
مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دستِ غیر کے نہیں چلتا یہ زینہار
اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولہا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہوسوار
سبزہ سے خط سیاہ وسیہ سے ہوا سفید
تھا سروسا جوقد سوہوا شاخِ باردار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے، کر اس طرف گزار

اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ اس گھوڑا کے مٹھّا اور سست رفتار ہونے کا قصہ تو آپ نے سن لیا، اب ایک اور واقعہ اس سے متعلق ہے، جو میں بیان کرتا ہوں، سو آپ یہ سارے واقعات گھوڑے کے مالک کی زبانی بیان کرتا ہے، گھوڑے کا مالک اپنی اور اس گھوڑے کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب مرہٹوں نے دلی پر حملہ کیا تھا، اس وقت مجھ سے لوگوں نے کہا کہ یہ لڑائی کا وقت ہے، لہٰذا اب آپ بھی آمادۂ کار ہوں، ابھی تک تو آپ نے آرام سے گھر میں بیٹھ کر عیش کی زندگی گزاری ہے، لیکن اب اپنے اس گھوڑے پر سوار ہوکر لڑائی کے میدان میں سینہ سپر، ہوئیے۔ لوگوں کے کہنے سننے پر میں نے مجبور ہوکر اس گھوڑے کی پیٹھ پر زین بندھوائی اور خود ہتھیار باندھ کر اس پر جا سوار ہوا۔ جس کیفیت سے میں اس گھوڑے پر سوار تھا، خدا دشمن کو بھی ویسا ذلیل وخوار نہ کرے، کہ دونوں ہاتھ میں کوڑا لیے ہوئے تھا، منھ میں اس کی لگام دبائے ہوئے تھا اور مسلسل تِک تِک یعنی پاؤں کی ایڑیوں کو گھوڑے کے پیٹ میں اس کے چلنے کے واسطے اس قدر تیزی سے اور زور سے مار رہا تھا کہ، اس کی وجہ سے میرے پاؤں زخمی ہوگئے تھے، آگے سے گھوڑے کو سائیس تو بڑہ دکھاتا تھا کہ کسی طرح سے وہ کھانے کی چیزوں کو دیکھ کر تو چلے، لیکن اس پر بھی وہ نہیں چلتا تھا تو پیچھے سے نقیب اس کو لاٹھی سے بے تحاشہ مار رہا تھا، لیکن اس لالچ، مار پیٹ اور اتنی تدبیر پر بھی وہ روبہ راہ نہ آتا تھا، یعنی چلنے کا نام تک نہیں لیتا تھا، اور پہاڑ کی طرح زمین پر جما ہوا تھا، میری یہ کیفیت دیکھ کر مذاق اور ہنسی کے طور پر میرے اردگرد آکر لوگ جمع ہوگئے اور اکثر تدبیر کرنے والوں نے اپنے مشورے دینے شروع کر دیئے۔ کوئی کہتا کہ اس گھوڑے کے پاؤں میں پہیئے لگا دو تا کہ یہ چل نکلے، یا بادبان باندھ کر ہوا کے سپرد کر دو تا کہ یہ اڑ ہی جائے۔ غرض کہ میں کیا بیان کروں کہ اس گھوڑے کی شکل کو دیکھ کر اپنی تلوار جیسی زبان کاٹ کاٹ کر لوگ کس کس طرح سے گل نثار کرتے تھے یعنی کیا کیا بک رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ گھوڑا نہیں ہے بلکہ بز کوہی، یعنی پہاڑی بکرا ہے، کوئی کہتا کہ یہ ولایتی گدھا ہے۔ کوئی مجھ سے سوال کرتا کہ تو نے ایسا کون سا گناہ کیا کہ کوتوال نے تجھے گدھے پر سوار کر دیا۔ پھر ایک شخص اس مجمع میں آکر کہنے لگا کہ نہ یہ سواری گدھے کی ہے، اور نہ ہی اس کے سوار نے کوئی گناہ کیا ہے بلکہ سپاہی کے بھیس میں کوئی ڈائین چرغ پر سوار ہوکر جارہی ہے، چرغ بمعنی ایک درندہ جانور ہے کہ چلتے وقت اس کی ہڈیاں چرچر بولتی ہیں، یہ لکڑ بگھا یا تیندوا جیسا ہوتا ہے۔ لوگ اسی ہنسی مذاق میں مصروف تھے کہ ایک اور فتنہ سامنے آیا اور مجھے اس سے بھی دوچار ہونا پڑا، ہوا یہ تھا کہ دھوبی اور کمہار کے گدھے اسی دن گم ہوگئے تھے، جب انھیں اس واقعے کی خبر ملی تو وہ دونوں اپنے اپنے گدھوں کی تلاش میں یہاں آگئے اور ہر ایک نے میرے اس گھوڑے کو اپنا گدھا سمجھا اور ایک طرف سے دھوبی اس کے کان پکڑے ہوئے تھا تو، دوسری طرف سے کمہار اس کی دم پکڑ کر کھینچ رہا تھا، ان تمام بیانات کو شاعر نے شعر میں اس طرح پرویا ہے:

مٹھّا تو اس قدر ہے وہ ، جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اک اور دن کی حقیقت کہوں میں یار
دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ، ہے وقت کار
مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے، گھر میں بیٹھ
ہوکر سوار ، اب کرو میداں میں کارزار
ناچار ہو کے ، تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن ، میں کیا کہوں
دشمن کو بھی ، خدا نہ کرے ، یوں ذلیل وخوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں، پکڑے تھا منھ میں باگ
تِک تِک سے پاشنہ کی، مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے ، تو بڑا اسے دکھلائے تھا سائیس
پیچھے ، نقیب ہانکے تھا ، لاٹھی سے مارمار
ہرگز وہ اس طرح بھی ، نہ آتا تھا روبہ راہ
ہلتا نہ تھا زمین سے ، مانند کوہسار
اس مضحکے کو دیکھ ، ہوئے جمع خاص وعام
اکثر مدبروں میں سے ، کہتے تھے یوں پکار
پہیئے اسے لگاؤ ، کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ ، پون کے دو اختیار
میں کیا کہوں؟ غرض کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ
تیغ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار
کہتا تھا کوئی ، ہے بزِ کوہی ، نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ، ہے گا ولایت کا یہ حمار
پوچھے تھا، کوئی مجھ سے ، ہوا تجھ سے کیا گناہ؟
کوتوال نے ، گدھے پہ تجھے ، کیوں کیا سوار
کہنے لگا پھر آکے ، اس اجماع میں کوئی
مرکب نہ یہ گدھا ، نہ یہ راکب گناہ گار
سمجھوں ہوں میں تو یہ، کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائین چلی ہے سیر کو، ہو چرغ پر سوار
اس مخمصے میں تھا ہی ، کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا ، مجھ سے پھر دوچار
دھوبی، کمہار کے گدھے، اسی دن ہوئے تھے گم

اس ماجرے کو سن ، کیا دونوں نے واں گزار
ہراک نے اس کو ، اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑ ے تھا دھوبی کا ن ، تو کھینچے تھا دم کمہار

سوداؔ کے اندر خلا قانہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی ، وہ تخیل کے روز سے پست کو اعلیٰ اور بلند کو ذلیل بنا دیتا تھا ، اس قصیدہ میں سوداؔ نے اپنی اس صلاحیت کا نمایاں مظاہرہ کیا ہے ۔ ایک گھوڑے کو کمزور اور ذلیل دکھانے کے لیے وہ تخیل کی نادرہ کاری کے جوہر دکھاتا ہے، اور واقعات کی مدد سے وہ اپنے نادر خیالات کو اس طرح جما دیتا ہے کہ پھر ان کو اس جگہ سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ غرض کہ اس اسپِ نابکار کا مالک مرہٹوں سے لڑنے کے لیے اپنے اس گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود بھی گھوڑا چلنے کو تیار نہیں ہوتا ہے، اس ذلت کو دیکھ کر مالکِ اسپ کے دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں میں ذلت کے دریا میں ڈوب نہ جاؤں ، کیونکہ اس گھوڑے کی بدپشمی یعنی برے بالوں والا ہونے کی وجہ سے بچے اسے بھالو اور خرس سمجھ رہے تھے اور اس ریچھ کا تماشہ دیکھنے کے واسطے بے شمار لڑکے اس گھوڑے کے اردگرد جمع ہو گئے تھے ۔ کوئی لڑکا سپاری اور چھالیہ اس کے منھ میں رکھتا تھا اور کوئی اس کے جسم سے بار بار اس کے بال اکھاڑ رہا تھا ۔ قدیم دور میں ریچھ کے منھ میں سپاری کا رکھنا دافع سحر تصور کیا جاتا تھا اور ریچھ کے بال بچوں کے گلے میں نظر بد سے بچنے کے واسطے ڈالے جاتے تھے ۔ غرض کہ اس گھوڑے کو ریچھ سمجھ کر اس جیسا سلوک کیا جا رہا تھا ۔ لڑکے مجھ سے کہتے تھے کہ تو مجھے بھی اس ریچھ پر چڑھا لے، اس کے بدلے میں میں تجھے پیسے دونگا ، کیونکہ آج نوچندا اتوار کا دن ہے ۔ صرف انسان اور لڑکے ہی یہاں جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ کتے بھی اردگرد آ کر جمع ہو گئے تھے اور اس ریچھ نما گھوڑے کو دیکھ کر ، جو کہ عجیب ہیئت کا معلوم ہو رہا تھا ، بے تحاشا بھونک رہے تھے ۔ اس وقت جب میں نے اپنی اس مصیبت آمیز ذلت کا جائزہ لیا تو بے اختیار رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کرنے لگا

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں ۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے ۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے ۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں ، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں ۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی ۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

کہ اے خدا تو میری اس پریشانی کو حل کر، میں چلا تھا مرہٹوں سے جنگ کرنے کے لیے، اب میں یہاں دھوبیوں سے جھگڑوں کہ لڑکوں کو جواب دوں ، یا پھر کتوں سے لڑوں ۔ خدا خدا کر کے میری دعا قبول ہوئی اور کسی طرح سے میں میدان جنگ تک پہنچا ۔ میدان جنگ میں پہنچ کر سب سے پہلے ہاتھ اٹھا کر میں نے پھر یہ دعا مانگی کہ خدا کرے پہلی ہی گولی اس گھوڑے کو لگ جائے تا کہ کسی طرح سے میرا پیچھا چھوٹے ۔ خدا کی بارگاہ میں یہ دعا کر کے میں جنگ کے لیے تیار ہوا ، اتنے میں مرہٹہ بھی آ کر مجھ سے دوچار ہوا :

دریائے کشمکش ، ہوا اس آن موج پر
تھا عنقریب ، ڈوبۓ خفت سے یک کنار
بدپشمی اس کی دیکھ کے ، کر خرس کا خیال
لڑکے بھی واں تھے جمع ، تماشے کو بے شمار
رکھتا تھا کوئی لاکے ، سپاری کو منھ کے بیچ
مواس کے تن سے کوئی ، اکھاڑے تھا بار بار
کہتا تھا کوئی ، مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دونگا ٹکا تجھے میں ، ہے نوچندا ایتوار
کتے بھی بھونکتے تھے، کھڑے اس کے گرد و پیش
ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
اس وقت میں نے ، اپنی مصیبت پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے ، یہ رو رو کے زار زار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے، کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کہ ، مروں اپنا پیٹ مار
بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب
واں سے بہ ہر نمط ، کیا جنگاہ تک گزار
دستِ دعا اٹھا کے میں پھر وقت جنگ کے
کہنے لگا جناب الٰہی میں یوں پکار
پہلی ہی گولی چھوٹتے اس گھوڑے کو لگے
ایسا لگے نہ تیر ، کہ ہووے نہ تن کے پار
یہ کہہ کے میں خدا سے ، ہوا مستعد جنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ، دوچار

سوداؔ نے جس مضحکہ خیز انداز میں گھوڑے کو میدان جنگ تک پہنچانے کا مرحلہ طے کیا ہے، وہ بے

حد پر لطف ہے، مندرجہ بالا تفصیل سے اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اب جب شاعر نے میدان جنگ تک اس ذلیل گھوڑے کو پہنچا ہی دیا تو ظاہر ہے کہ اب جنگ بھی ہوگئی، اور کیسی پر لطف ہوگی یہ معلوم ہے ۔ اب ذرا اس لڑائی کا بھی جائزہ لیں ۔ بہر حال گھوڑے کا مالک اپنی لڑائی کا حال بیان کرتا ہے کہ ایک مرہٹہ آ کر مجھ سے دوچار ہوا، لیکن چونکہ وہ گھوڑا اس قدر کمزور، چھوٹا اور بوڑھا تھا کہ مجھے بار بار منھ کی کھانی پڑتی تھی اور ذلت اٹھانی پڑتی تھی، جب میں دشمنوں کی طرف ڈپٹ کر جاتا تھا تو مجھے ایسے دوڑنا پڑتا تھا، جیسے کوئی بچہ لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہوکر خود اپنے پاؤں سے دوڑتا ہے اور بطورِ کھلونا اس لکڑی کے گھوڑے سے کھیلتا ہے، بالکل وہی کیفیت میری اس وقت ہورہی تھی ۔ جب میں نے دیکھا کہ میدان جنگ میں شعلے بھڑک اٹھے ہیں، یعنی لڑائی شباب پر ہے اور میری یہ حالت ہے، تو میں نے وہاں رکنا دانشمندی کے خلاف جانا اور جنگ سے کنارہ کشی کا ارادہ کرلیا، اور اپنی جوتیوں کو ہاتھ میں اٹھایا اور اس گھوڑے کو بغل میں دبایا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ۔ عام طور پر یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے کہ جوتیوں کو بغل میں دبایا اور بھاگا، لیکن سوداؔ اس گھوڑے کو جوتیوں کے مقابلے میں بھی بے حیثیت اور ہلکا قرار دیتا ہے، اور جوتا ہاتھ میں اور گھوڑا بغل میں ۔ پھر گھوڑے کا مالک کہتا ہے کہ میں وہاں سے لڑتا ہوا شہر آ گیا اور جا کر اپنے گھر میں ہی دم لیا، یعنی چین کی سانس لی۔ اس شعر میں لفظ ''لڑتا ہوا'' کتنا پر لطف اور مضحکہ خیز ہے، کہ جس کی نوبت ہی پیش نہیں آئی اور جنگ میں شامل بھی رہے، یعنی گھوڑے سے اور اپنے ضمیر سے لڑنا پڑا ۔ مالکِ اسپ سے سوداؔ نے یہ گھوڑا سواری کے لیے مستعار مانگا تھا، اب اسی سوال پر گھوڑے کا مالک کہتا ہے کہ میرے گھوڑے کا یہ حال ہے اور یہ قصہ ہے، جو میں نے بیان کردیا، اب ان واقعات کو سن کر بھی تم اس گھوڑے کی سواری کرنا چاہتے ہو تو شوق سے لے جاؤ، گھوڑا حاضر ہے۔ پھر شاعر کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں سن کر میں نے اپنے اس دوست سے کہا کہ محض ایک گھوڑے کے لیے اتنا جھوٹ بولنا کیا ضروری تھا، صرف یہ کہہ دیتے کہ میرا گھوڑا ابلق یعنی چتکبرا ہے، اگر میں عقلمند ہوتا تو سمجھ لیتا کہ تمھیں گھوڑا نہیں دینا ہے ۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ یہ سارے واقعات سن کر، تب جا کر میں نے یہ قصیدہ لکھا ہے، اسی لیے میں نے اس قصیدہ کا نام ''تضحیکِ روزگار'' یعنی زمانے کی ہنسی، مذاق اور برائی، رکھا ہے:

گھوڑا تھا بس کہ لاغر و پست وضعیف وخشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے، جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی، یاں یہ بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں، گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہو اشہر کی طرف
القصہ، گھر میں آن کے میں نے کیا قرار
گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے، تم نے جو سنی
اس پر بھی دل میں آئے، تو اب ہو جیے سوار

سن کر تب ان سے میں نے، یہ قصہ دیا جواب
اتنا بھی جھوٹ بولنا، کیا ہے ضرور یار
گفتن ہمیں بس است کہ ''اسپِ من ابلق است''
سمجھونگا دل میں اپنے، اگر ہوں میں ہوشیار

سوداؔ نے تب قصیدہ کہا، سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدہ کا ''تضحیکِ روزگار''

حواشی:

۱۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ص:۲۳۰، پروفیسر محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۵ء

۲۔ نکات الشعراء، ص-۳۱، میر تقی میرؔ، نظامی پریس، بدایوں ۱۹۲۲ء

۳۔ سوداؔ، ص ۲۷۳، شیخ چاند، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

۴۔ سوداؔ، ص ۲۷۳

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

ذوق کی قصیدہ نگاری

امیر حمزہ

ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
دہلی
رابطہ: 8877550086

جب بھی ذوق کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو قصیدہ میں سودا کو سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور غزل میں غالب و مومن کو۔ لیکن کبھی بھی اس پہلو پر نظر نہیں ڈالی گئی کہ ذوق کی شاعری کے مطالعہ کے لیے ذوق کے زمانے کی دہلی فضا کے ساتھ ذوق کے آس پاس کے ماحول کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ ذوق کی ذات و شخصیت کے گہرے مطالعے کے ساتھ منسلکینِ ذوق پر بھی نظر رکھی جائے۔ بچپن کی شوخی اور لڑکپن تو ان کے قریب بھی نہیں پہنچا، یہی وجہ تھی کہ وہ عہد مراحق سے ہی خدا ترسی اور زہد و ورع کی جانب مائل ہو گئے تھے۔ اگر چہ ان کی طبیعت میں بذلہ سنجی اور ظرافت بھی تھی تاہم کسی بھی گفتگو میں استادی پن کا حکم نامہ یا انانیت نظر نہیں آتی ہے۔ شام کو عصر کے وقت شاید مجلس کی برخاستگی کے بعد مسلسل ایک لوٹے سے کلّیاں کیا کرتے تھے، اس متعلق مولانا محمد حسین آزاد کے سوال کے جواب میں کہتے کہ نہ جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ یہی عمل رات کی عبادت سے پہلے کا بھی ہوتا تھا۔ ان کے اندر عاجزی، انکساری اور سادگی کا دخل اس قدر تھا کہ خیال آتے ہی پڑوسی کے بیمار بیل کے لیے دعا بھی کرتے ہیں۔ تو ان تمام کے ساتھ مناسب ہوتا ہے کہ ذوق کی شاعری کا مطالعہ ان کی ذاتی زندگی کے تناظر میں بھی کیا جائے کیونکہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ تخلیق کار اپنی زندگی کا عکس اپنی تحریر میں کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتا ہے۔

ذوق کی پیدائش ۱۲۰۳ھ بمطابق ۱۷۸۸ء میں ہوتی ہے۔ تقریباً ۱۹/ برس کی عمر میں دربار ولی عہدی میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے اور یہ بات بھی نا قابل انکار تک مشہور ہے کہ ذوق کو ۱۹/ برس کی عمر میں خاقانی ہند کا خطاب مذکورہ قصیدہ پر ملتا ہے۔

جبکہ سر طان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

یہ بات سوالات کے دائرے میں ضرور آتا ہے کہ جس برس وہ دربار ولی عہدی سے منسلک ہو رہے ہیں اسی سال انہیں اعلیٰ ترین خطاب سے نوازا بھی جا رہا ہے۔ ساہتیہ اکادمی سے شائع شدہ تنویر احمد علوی صاحب کی کتاب ''ذوق دہلوی'' (مونوگراف) میں اس قضیہ کی جانب اشارہ ہے کہ تذکرۂ ''عیار الشعراء''، ''تذکرۂ صدر الدین'' اور ''تذکرۂ سرور'' میں اس خطاب کی جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے بلکہ ''تذکرۂ گلشن بے خار''

۱۲۴۸ھ میں اس خطاب کا پہلی بار ذکر ملتا ہے۔اس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے چوتھے عشرے میں ہی انہیں یہ خطاب ملا ہوا اور اس وقت ان کی عمر چالیس برس کے آس پاس رہی ہوگی۔ ۶/اکتوبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوتا ہے اور ۷/جنوری ۱۸۳۸ء کو بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی ہوتی ہے اسی موقع پر ذوق اپنا یہ مشہور قصیدہ:

روکش ترے رخ سے ہوگیا نور سحر رنگ شفق
ہے ذرّہ تیرا پر تو نو رسحر رنگِ شفق

لکھتے ہیں جس پر انہیں ملک الشعراء کا خطاب ملتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں قلی قطب شاہ سے لے کر محسن کاکوروی و جمیل مظہری تک قصیدہ نگار شعرا کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جب کہ غزل گو شعرا لاتعداد ہیں۔اردو کے عہد زریں میں میرؔ جیسا شاعر اپنی غزلوں کی وجہ سے خدائے سخن کے درجے پر فائز ہوتا ہے وہیں سوداؔ جیسا قصیدہ نگار قادرالکلامی میں میرؔ سے کوسوں دور نظر آتا ہے۔باوجود اس کے وہ قصیدہ کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔کچھ یہی صورت حال عہد غالبؔ میں بھی غالبؔ و مومنؔ اور ذوقؔ کے درمیان نظر آتی ہے۔فی زمانہ غالبؔ غزل کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں اور ذوقؔ قصیدہ کے۔غالبؔ و مومنؔ غزل کے میدان میں اپنے پیش رو کے ساتھ کھڑے نظر نہیں آتے ہیں لیکن ذوقؔ اپنے پیش رو سوداؔ کے ساتھ صنف قصیدہ میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں جس طرح سے میرؔ و غالبؔ کو غزل سے، انیسؔ و دبیرؔ کو مرثیہ سے اور میر حسنؔ و دیا شنکر نسیمؔ کو مثنوی سے جدا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سے ذوقؔ و سوداؔ کو قصیدے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔

قصیدہ میں تشبیب کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو غزل میں حاصل غزل کی ہوتی ہے۔جس طریقے سے یہ بات زبان زد ہے کہ بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے، قصیدہ اپنے اندر بھی وہی خصوصیت رکھتا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے پیش ہونے والا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہو۔اسی لئے شاعر اپنی تخلیقیت کی ساری قوت قصیدہ کے پہلے جز تشبیب میں لگا دیتا ہے۔ اگر تشبیب بہاریہ ہے تو اس میں لفظوں کے انتخاب میں وہ ہنرمندی برتی جاتی ہے کہ موسم کے تطابق سے ایسی مسحور کن فضا قائم کرے کہ قاری یا سامع سنتے ہی متوجہ ہوجائے۔ذوقؔ نے بھی تشبیب میں اپنی اس ہنرمندی کو پیش کیا ہے۔ایک قصیدے کی تشبیب سے ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
ذمثل ِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موج
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بیدمجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہرنخل کی سرخی ہے جوں برگ حنا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا
نسخے پر لکھنے نہیں پاتا 'ہوالشافی' طبیب
کہتا ہے بیمار' بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا'

پہلے شعر میں باغ عالم کی ترکیب سے پوری دنیا کی فضا کو ہموار کردیتے ہیں اور جو ہوا چل رہی ہے اس ہوا کی خوبصورتی کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں جیسے صحت مند انسان کی نبض چلتی ہو۔شاعر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخیل میں کتنی وسعت رکھتا ہے۔ ایک غیر محدود وسیع و بسیط دنیا کی صورت حال ایک محدود جسم سے پیش کرتا ہے۔بادشاہ کو یہ سمجھتے دیر نہیں لگتی ہے کہ میرے آنے سے اس پوری دنیا کا نظام اس طریقے سے درست ہوجاتا ہے جیسا کہ آخری شعر میں طبیب نسخے پر 'ہوالشافی' لکھ نہیں پاتا ہے کہ مریض اپنی مکمل شفایابی کی خبر دیتا ہے۔اس میں کوئی بعید نہیں ہے کہ بادشاہ کی تاج پوشی سے پہلے اور بعد کی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اس بہار میں ہوا ایسی چل رہی ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا ایسی بن گئی ہے جس پر سیکڑوں دارالشفاء بھی رشک کرنے لگے اور اب شبنم کا اثر گلوں پر کچھ ایسا ہے جیسے زخم جگر پر مرہم کا۔ اور ٹوٹی ہوئی شاخ میں بارش کا قطرہ مومیا کی تاثیر لئے ہوئے ہے۔ بعد کے اشعار میں شفا کے بعد کی جو صورت حال ہے اس کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے دہر کے مزاج سے جنوں بھی زائل ہوگیا اور اس کی مناسبت سے کہتے ہیں کہ صحرا میں اب بید مجنوں کا بھی ذکر نہیں۔ بید تو خود ہی ایک پتلی سی چھڑی ہوتی ہے اور بید مجنوں نرم اور پتلی سی گھاس ہوتی ہے۔ مجنوں بھی جنوں کے عالم میں بھوکا پیاسا رہتے رہتے پتلا دبلا ہوجاتا ہے اور صحرا کی جانب نکل پڑتا ہے اور بید مجنوں بھی صحرا میں ہی پایا جاتا ہے۔اس مناسبت سے صحرا کا استعمال مجنوں کے ساتھ جس خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے وہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اس کے بعد کے بہاریہ اشعار میں ذوقؔ نے مضمون میں کمال کی ندرت پیدا کی ہے۔ماحول سازی اور فضابندی بھی خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے کہ طبیب نسخے پر ہوالشافی لکھتا ہی ہے کہ بیمار کہتا ہے کہ شفا مل چکی۔ یعنی اب دوا لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ غلو ہے لیکن ذوقؔ نے اپنی فنکاری سے غزل کا فطری پن اور حقیقی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پیش کردہ اشعار اگرچہ تشبیب کا حصہ ہیں لیکن مدح کا ناگزیر جز تصور کیا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔اسی طریقے سے برسات کے خوبصورت موسم کا ذکر ذیل

کے قصیدہ میں ہوا ہے۔

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی ، قدح کش کی بن آئی

ذوق اپنے عہد کے تمام مروجہ علوم وفنون سے باخبر تھے یہی وجہ ہے ان کے قصیدوں میں علم ہیئت و نجوم ،منطق وفلسفہ،فقہ وتفسیر،تصوف وسلوک ،تاریخ و واقعات اور موسیقی وطب وغیرہ کی اصطلاحات کثرت سے ملتی ہیں۔جیسا کہ اوپر لکھے گئے قصیدے کی تشبیب میں بھی مکمل طب کی فضا نظر آتی ہے۔کسی بھی اصطلاح سے کما حقہ واقف ہونا اور اس کو اپنے کلام قدرت سے شاعری میں پیش کرتے ہوئے معانی میں دوبالگی پیدا کر کے شعری حسن عطا کرنا بہت ہی مشکل امر ہوتا ہے، پھر منطق وفلسفہ جیسے خشک موضوعات کو اشعار کے بہاؤ میں پیش کرنا اور بھی مشکل امر ہوتا ہے۔لیکن جہاں تک ذوق کے قصائد کے مطالعہ سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے علمی اصطلاحات کو استعمال کر کے شعر یت اور شعری حسن دونوں کو قائم رکھا ہے۔صرف دو شعر علم ہیئت اور منطق کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم ِ گاہ عیش و نشاط
کہ 'شمس بازغہ' کی جگہ پڑھے ہیں 'بدرِ منیر'
اگر پیالہ ہے صغر یٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سر مست ہیں صغیر و کبیر

مدرسہ جو عموماً کبھی بھی عیش ونشاط کی بزم گاہ نہیں بنی ، بننا تو دور کی بات ہے بلکہ نصابات میں بھی وہ بہت ہی خشک واقع ہوئی ہے ۔ وہاں تو حکمت جیسے خشک موضوع کے لیے بھی ''شمس بازغہ'' جیسی مغلق کتاب پڑھائی جاتی تھی لیکن اب تو وہ بھی 'بدر منیر' کے پڑھنے پڑھانے سے سراپا بزم گاہ عیش ونشاط بن گیا ہے۔شمس بازغہ مدارس میں داخل ایک نصابی کتاب تھی جو فلسفہ یونان کے دفاع میں پڑھائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں اپنے فن پر یہ آخری کتاب تھی اس سے پہلے 'صدرا' اور 'میبذی' شامل نصاب ہوا کرتی تھی ۔ (میبذی بعض مدارس میں اب بھی ہے) گویا انہوں نے اس کتاب کا ذکر محض یونہی نہیں کر دیا بلکہ ایک کی خشکی اور مغلق پن کے ساتھ دوسرے کی رنگینی اور حسن کلام کا بھی تقابل ہے ۔دوسرے شعر میں پیالہ اور سبو کی مناسبت سے علم منطق کی اصطلاح سے قضیہ کو بہت ہی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔وہ اس طرح کہ صغریٰ اور کبریٰ منطق کے دو قضیے ہوتے ہیں ۔جیسے قضیہ صغریٰ 'سمندر کا پانی ہے' اور قضیہ کبریٰ 'پانی گرم ہے' ان دونوں میں جو ایک مشترک چیز ہے وہ 'پانی' ہے اسے حد اوسط کہتے ہیں اور یہ نتیجہ میں ساقط ہو جاتا ہے تو گویا نتیجہ ہوا 'سمندر گرم ہے'۔اب شعر پر نظر ڈالتے ہیں تو بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے پیالہ کو صغریٰ اور سبو کو کبریٰ کہا ہے،ظاہری طور پر پیالہ چھوٹا برتن ہوتا ہے اور سبو بڑا برتن ۔اس لیے پیا لہ کو چھوٹا اور سبو کو بڑا کہا ہے۔لیکن منطق کی اصطلاح میں 'پیالہ ہے صغریٰ' قضیہ صغریٰ ہوا اور 'سبو ہے کبریٰ' قضیہ کبر یٰ ہوا ۔ پیا لہ اور سبو دونوں ظرف ہیں اس لیے اس کو حد اوسط سمجھ لیا جائے۔دوسرے مصرع میں حد اوسط گرا کر کے نتیجہ جو نکالتے ہیں اس سے بادشاہ بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کہ جس کے حصہ میں جو بھی آیا خواہ صغیر ہو یا کبیر سب کے سب آپ کے کرم سے مست ہیں ۔ الغرض اس قصیدے میں کئی ایسے اشعار ہیں جن پر خود قصیدہ کو فخر ہے۔اس بات کا ذکر ہو چکا کہ 'کلام الملوک ملوک الکلام' لیکن اگر کلام انسانی کی بات کی جائے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ قصیدہ بھی ملوک الکلام ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قصائد کو ہی 'سبعہ معلقہ' ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے ۔اگر ملوک الکلام (قصیدہ) کے ساتھ ملوک الارض والسماء (اللہ) کا کلام بھی نگینوں کی طرح جڑ کر خوبصورتی کے ساتھ دعا کے حصے میں پیش کیا جائے تو پھر کیسے کوئی اپنے خزانے کو روک سکتا ہے:

مصحف رخ ترا اے سایہ رب العزت
کھول دے معنی اتممت علیکم نعمت

ذوق کے قصائد کے متعلق ناقدین کی رائے دو خانوں میں ہے۔ایک جنہوں نے ذوق کو اچھا قصیدہ گو شاعر مانا ہے۔ وہ برج موہن دتاتر یہ کیفی،تنویر احمد علوی، انوار الحسن اور ابو محمد سحر ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جنہوں نے ذوق کے متعلق معمولی قصیدہ نگار کی رائے قائم کی ہے ان میں امداد امام اثر ،محمود الٰہی ،کلیم الدین احمد اور پروفیسر عبدالحق ہیں۔ یہ دونوں طرف کی باتیں ہوگئیں ۔آپ نے تو علمیت کی کارفرمائی میں ذوق کے قصائد کے اشعار تو ملاحظہ کر لیے اب سودا کے اشعار سے بھی حظ اٹھائیں۔

جبیں ایسی کہ جگر کا ماہ ہوجاوے داغ
اس کی تشبیہ سے جب اس کو تجاوز دے فلک
قتل کرنے کا یہ جوہر نہ ہو شمشیر کے بیچ
اس کے ابرو سے مشابہ نہ بناویں جب تک

تشبیب کے ان اشعار میں سودا نے جن شاعرانہ صناعی ، مبالغہ، رعایتوں ، مناسبتوں اور لفظی انسلاکات کو برتا ہے وہ ذوق کے یہاں نہیں ہے تاہم تقلید بھی نہیں:

نگاہ ساغر ، کشِ تماشا، بیاضِ گردن صراحی آسا
وہ گول بازو، وہ گورے ساعد، وہ پنجہ رنگیں بخونِ مرجان
کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اس پر سونور لہر کھائے پھر اس پہ ہیں دو قمر فروزاں

فرق آپ کو واضح نظر آئے گا ان میں مزید کلام کی ضرورت نہیں ہے۔ بات صرف تشبیب تک ہی رہی تاہم اپنے اس مضمون کو کوثر مظہری کے ان الفاظ سے ختم کرتا ہوں ''ضرورت اس بات کی ہے کہ ذوق کے قصائد کو غیر جانبداری اور ایمانداری کے ساتھ دیکھا ، پڑھا اور پرکھا جائے ورنہ وہی بات کہی اور دہرائی جاتی رہے گی کہ قصیدہ میں سودا بڑا اور غزل میں غالب ،قصہ تمام ۔ادب کی قرات اور تفہیم کا یہ رویہ سراسر معاندانہ لگتا ہے''

(شیخ محمد ابراہیم ذوق،کوثر مظہری،ص ۶۰)

❑❑❑

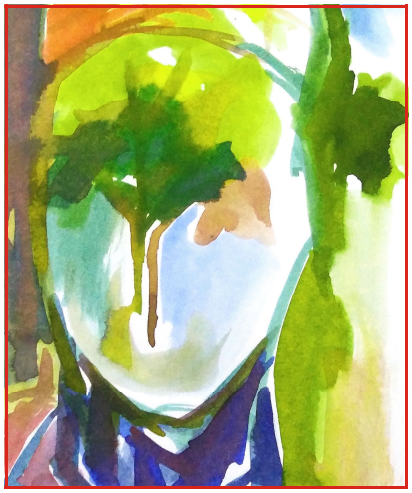

امیر مینائی کی قصیدہ نگاری

محمد ارشد

شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج
دہلی یونیورسٹی۔لودھی روڈ، نئی دہلی
رابطہ: 9213307499

داغؔ دہلوی کے ہم عصر شعراء میں ایک اہم نام امیر احمد امیرؔ مینائی (۲۳/فروری ۱۸۲۹ تا ۱۳/ اکتوبر ۱۹۰۰) کا بھی ہے۔امیرؔ مینائی لکھنو اسکول کے آخری بڑے شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔ان کی شاعرانہ مزاج میں ایک ٹھہراؤ ہے۔اسی ٹھہراؤ کے باعث ان کے کلام میں ندرت،تازگی اور لطافت کی بہتات ہے ۔ان کی شاعرانہ عظمت میں وقت اور حالات کے پیش نظر لکھنو کے مخصوص رنگ وآہنگ سے لبریز ہے۔امیر مینائی ہمیشہ بلند نہج پر شعر کہتے تھےلیکن بعض وقت معاشرے کی پستی اور لکھنوی شعری مزاج کے پھکڑ پن سے بھی نہ بچ سکے اور بعض ابتدائی کلام کے نمونے چھوڑ گئے۔ابتدائی دور میں ناسخ کی پیروی کی اور بعد میں داغ کی شہرت اور مقبولیت کے باعث ان کی تقلید کرنے پر مجبور ہوئے۔

امیرؔ مینائی کی شخصیت میں فقیہ،صوفی اور شاعر بیک وقت تین شخصیتوں کا مجمع تھا۔وہ متقی اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔دنیاوی امور سے کافی دور تھے۔اس کے باوجود ان کی شاعری میں فاسق وفاجر کے جذبات و احساسات،جنس اور جنسی تلذذ کی کیفیت کی بھرمار ہے کیونکہ شاعر خیالی تصورات کے ذریعے ہی اپنی شاعری کو پروان چڑھاتا ہے۔اسی وجہ سے امیر مینائی نے اپنی شاعری میں مذہب وتصوف،فکری میلانات ،خمریات،مجاز پرستی،داخلیت اور وارداتِ قلبی،رجائیت وکیف پروری،بہاریہ اشعار،معنی آفرینی،انفرادی رنگ وآہنگ سے مکمل طور پر لیس نظر آتے ہیں۔انہوں نے شاعری میں غزل،نظم،مثنوی،واسوخت،رباعی ،مسدس،قطعہ،تضمین وغیرہ بھرپور لکھے ہیں۔

جہاں تک امیرؔ مینائی کی قصیدہ نگاری کا تعلق ہے تو انہوں نے خوب قصیدے لکھے ہیں۔ان کے قصیدوں کی دنیا کافی وسیع تھی جن میں بہاریہ،عاشقانہ،حکیمانہ،فخریہ اور رندانہ مضامین کے ذریعے اپنے جواہر اور کمالات کی فنکاری دکھائی ہے۔اسلوب اور انداز بیان میں اپنے ہم عصر شعراء سے منفرد لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ لکھنوی شعرائے متوسطین کے عہد میں قصیدہ گوئی کے میدان میں کوئی بھی شہرت دوام کے حامل نہیں بلکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کچھ شعراء کے کلام قصیدے سے خالی نہیں۔اُن دنوں لکھنو میں قصیدہ گوئی کے دو رنگ نظر آتے ہیں۔ایک وہ جو سوداؔ و مصحفیؔ اور انشاؔ یا دہلوی شعراء کی تقلید کرتے ہیں اور دوسرا وہ جو مقامی رنگ وآہنگ اور آسان بیانی کی چاشنی سے ندرت اور تازگی پیدا کی ہیں۔

امیرؔ مینائی نے قصیدہ گوئی میں دہلوی رنگ و روپ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صنفِ قصیدہ کے قدیم اور مروجہ طرز سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ان کے مطبوعہ قصیدوں کی تعداد بارہ ہیں۔جن میں سات مدحیہ قصائد ہیں جو نوابین اور امراء کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ان میں نواب کلب علی خان،نواب حامد علی خان،نواب مشتاق علی خان (والیانِ رامپور)،نواب شاہ جہاں بیگم (والیٔ بھوپال) اور میر محبوب علی خاں (نظام حیدرآباد) ہیں اور پانچ قصیدے نعت ومنقبت کی شکل میں ہیں جو پیغمبر اسلامؐ، حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کی شان میں ہیں۔اس کے علاوہ غیر مطبوعہ قصیدوں کی تعداد ان گنت ہیں۔شاہِ اودھ واجد علی شاہ کی شان میں بھی انہوں نے قصیدے لکھے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ڈاکٹر محمود الٰہی امیر مینائی کے قصیدوں کی خصوصیات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''امیرؔ مینائی نے قصیدے کی فصاحت و بلاغت کے پہلو پر زور دیا۔علمی اور فنی بے راہ روی سے وہ اجتناب کرتے ہیں۔مضمون آفرینی ان کی گُھٹی میں ہے مگر ساتھ ہی تخیل کا اعتدال بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔استعارے پر وہ جان دیتے ہیں مگر ان کے استعارے تہہ در تہہ اور ورق اندر ورق نہیں ہوتے۔شکوہِ الفاظ اور شوکتِ تراکیب میں وہ الفاظ کی تراش خراش اور برجستگی کو ملحوظ رکھتے ہیں''۔

(اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ص ۳۹۶)

اس طرح امیرؔ مینائی نے قصیدوں کے بہاریہ تشبیب میں،تخیل آفرینی،موسم بہار وخزاں،مبالغہ آرائی،سراپا نگاری،مناظرہ وغیرہ سے بھر پور کام لیا ہے جب کہ اردو میں اس کا پہلا نمونہ سودا کا قصیدہ ''در مدح نواب سیف الدولہ خاں بہادر پسر سید صلابت خاں'' کی تشبیب ہے۔یہ روش بہت مشکل اور نادیدہ ہونے کے باوجود امیر مینائی نے نواب حامد علی خاں کی مدح میں ایک قصیدے کی تشبیب میں بہاریہ کا پیرایہ استعمال کیا ہے۔جس میں وہ بھرپور کامیاب نظر آتے ہیں۔اس کا مطلع یہ ہے:

سلطانِ شرق نے جو بصد عزو افتخار
بُرجِ حَمل کو آگے کیا تختِ زَرنگار

مذکورہ شعر سودا کے اس قصیدے کی چھاپ ہے۔

بُرج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار
کھینچے ہے اب خزاں پہ صف ِلشکرِ بہار

امیرؔ نے اگر فنی تصورات کو تقویت پہنچائی ہے تو دوسری طرف ان میں محاکات کے تناسب کو باقی رکھ کر اس کی اچھی روایات کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ان کی بہاریہ تشبیبوں میں مبالغہ آرائی کا رنگ دیکھیے۔

اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیض نمو
نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل

(قصیدہ در مدح نواب کلب علی خان)

قافلے بوئے گُلِ تر کے ہیں راتوں کو رواں
کیا عجب چاندنی کے فرش میں پڑ جائے شکن

(قصیدہ در مدح نواب حامد علی خان)

یا پھر سرزمین دکن کی تعریف کے لیے تشبیب میں سراپا نگاری کی انفرادیت اس انداز میں پیدا کی ہے۔

اللہ اللہ رے بہارِ چمنستانِ دکن
حور پرہے نہ یہ جوبن'نہ پری پر یہ پھبن

امیرؔ نے ایک قصیدہ ''مشتمل بر مناظرۂ دانش ووہم'' میں کلب علی خاں کی مدح کی ہے۔اس قصیدے میں امیر نے مکالمے کے ذریعے اپنے ممدوح کی خوبیاں گنوائیں ہیں ایسے میں اس قصیدے کے ذریعے مناظرہ کا پورا نقشہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔دو ملازمین سرکار دانش اور وہم کا تذکرہ دیکھیں:

کہ ملازم جو ہیں سرکار کے دو دانش و وہم
درِ دولت پہ ہے ہنگامہ لڑے ہیں باہم
بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی
کہ باہم گتھ گئے ہیں صورتِ خط توام
حاضر بزم ہوئے وہ تو ہوا یہ ایماں
کیوں لڑے کیا سبب جنگ ہے آگاہ ہوں ہم
عرض دانش نے یہ کی روزِ ابد تک قائم
یہ حکومت یہ ایالت یہ شہامت یہ حشم
ایک حاکم ہے فلک جاہ خرد مند زکی
صاحب ِعلم و ہنر معدن ِاخلاق کرم
نام ہے کلب علی خاں بہادر ِجم جاہ
جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصرو جم
علم میں حلم میں جو دو کرم و ہمت میں
ہے وہ یکتائے زمانہ سرِ اقدس کی قسم
میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا
بلکہ مارا رہِ انکار میں منکر نے قدم

زمانہ قدیم سے ہی الفاظ کی شان و شوکت قصیدے کا بڑا سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔امیر نے بھی ایسی سنگلاخ زمین میں بڑے مزے کے قافیے لائے ہیں جیسے جھٹ پٹ،اُچٹ،جھنجھلاہٹ،تریاہٹ،گدراہٹ وغیرہ۔غرض انہوں نے ایسی مشکل زمین میں سخت قافیے بیان کیے ہیں۔امیرؔ نے اس قصید میں ان بلندیوں کو چھو لیا ہے جبکہ ان سے قبل مصحفی اور انشا نے بھی اسی زمین میں قصیدے کہہ چکے ہیں۔امیرؔ کا یہ انداز دیکھیں:

دو قصیدے جو سُنے مصحفی و انشا کے
واقعی سکّہ رائج ہیں ولیکن سِلپَٹ
سخت پتھر سے جو تھے قافیہ نامانوس
کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغ زباں ان کی اُچٹ
آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا
کرلیا تازہ مضامیں کا علاقہ کورٹ
شب دوشنبہ جولی خواب میں میں نے کروٹ
آئی اک حور تھا پاس اُلٹ کر گھونگھٹ

گریز کا یہ انداز دیکھیں:

اس جگہ سے میں کروں ہو کے مخاطب تعریف

چاہے شاہد معنی کی بدل دوں کروٹ
غائبانہ ہوا گر نصف خطا بھی ہو نصف
ایک دروازے کی خاطر ہیں مناسب دوپٹ
ہیں ترے باب حکومت کے دو عالم دوپٹ
مل کے یہ چار کڑی ایک بنی ہے چوکھٹ

اپنے ممدوح کی انتظامی صلاحیت اوراس کی ہمت ومردانگی، جرأت وشجاعت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

واہ کیا قصر حکو مت ہے رفیع اور وسیع
جسکے دروازے کے ہیں جرأت و ہمت دوپٹ
عدل وہ ہے کہ زمانے میں نہیں بوئے فساد
ہوتہہ تک جو پھیکتوں میں کبھی ہو کھٹ پٹ
در دولت ہے عجب فیض کی چوپڑ کہ جہاں
کبھی پڑتا نہیں پانسا کسی تقدیر کا پٹ
آگے ہمت کے ہے یہ دولت دنیا کا مآل
لعل وگوہر کو سمجھتا ہے وہ کوڑا کرکٹ

امیرؔ مینائی نے کہیں کہیں ممدوحین کے اوصاف اور ان کے زمانے کے حالات و واقعات کا بیان بھی بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔جس سے ان کے قصائد میں اصلیت وواقعیت بھی ملتی ہے۔نواب حامد علی خاں کی مدح کے ایک قصیدے میں رام پور میں کارخانوں کی ترقی اور مسجد اور مسافر خانے وغیرہ کی تعمیر کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

ایک بات ان میں سے مذکور یہاں ہوتی ہے
جس کو سنتے ہی کہے خلق خدا صلِّ علی
ہے اسی سے تو ہر اک کام میں ہر دم رونق
کا رخانوں میں اسی سے تو ترقی ہے سوا
تھی جو منظور غریب الوطنوں کی راحت
اک نیا گاؤں بھی پاس اس کے بسایا ایسا
کہ بنائی گئی ہے ایسی جگہ اک مسجد
جس جگہ فرض تھا وا جب تھا کہ ہوا یسی بنا

امیرؔ مینائی نے بزرگان دین کی شان میں بھی ان کے فضائل ومحاسن کو پیش کیا ہے جس سے ان کی مدح سرائی جا بجا سیرت نگاری سے ہم کنار نظر آتے ہیں ۔بزرگان دین کی مدح میں مذہبی روایات اور اعتقادات پرزور بجائے خوداسی کا نتیجہ ہے۔کہیں کہیں

نہ جانے کیا تھا کل نیرؔ کہ بزمِ جام و مینا میں
ہوئی محسوس ساقی کو ہماری ہی کمی تنہا

مدیر ماہنامہ 'شمع ادب'
معروف شاعر ،معتبر و مستند صحافی، سید توکل حسین نیر سلطانپوری، جن کی شاعری تصوف، احتجاج وانقلاب کی ایک موثر ترین آواز ہے، اور ان کی ادبی صحافت اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ 'نیادور' بہت جلد نیرؔ سلطانپوری کی مجموعی ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جارہاہے۔قلمی تعاون درکار ہے۔

انہوں نے بعض امور کا بیان بڑی گہری معنویت کے ساتھ کیا ہے۔مثال کے طور پر ایک نعتیہ قصیدے میں معراج کے ذکر میں بزم خداوندی کا بیان ملاحظہ ہو۔

کچھ عجب بزم کہ تھی بزم کے اطلاق سے دور
عود بے مجمرہ و نغمہ بے پردہ ٔساز
ہم بغل شانہ سر زُلف رسا سے لیکن
نہ کوئی زلفِ مسلسل' نہ کوئی دست دراز

یا پھر بزرگان دین کی سیرت نگاری کی یہ اچھوتی مثال جس میں انہوں نے امام حسینؓ کی منقبت میں لکھا ہے کہ:

چراغِ کعبہ ٔ دیں' شہسوارِ دوشِ رسول
امام سبحہ ٔ خاصان ایزد قدّوس
جوماں سے کی سحر عید ہٹ لڑکپن میں
خدانے بھیج دیا خود بہشت سے ملبوس
پسرِ رسولؐ نے قرباں کیا نواسے پر
اس افتخار سے واقف نہیں ہے روم کہ روس

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امیر مینائی نے اپنے قصیدوں میں لفظی ومعنوی ،صنائع و بدائع کا خوب استعمال کیا ہے ۔بعض قصیدے مشکل زمینوں میں بھی انفرادیت کے حامل ہیں۔غرض کہ وہ قصیدہ گوجنھوں نے سودا کی تقلید کے دائرے میں اپنی راہ الگ نکالنے کی کوشش کی ۔امیرؔ کے قصائد میں بھی تقلید اور اُپج کی یہی رَوش دکھائی دیتی ہے۔امیرؔ مینائی نے لکھنو میں اپنے ہم عصر شعراء کے مابین دہلوی طرز قصیدہ گوئی کو کامیابی سے اپنایا اور ترقی دی۔ڈاکٹر ابومحمد سحر نے اپنی کتاب 'مطالعہ امیر' کے اس اقتباس پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

''امیرؔ کے قصائد میں ایک جہانِ معنی آباد ہے۔مضامین کے تنوع اور رنگا رنگی کی وجہ سے ان کا حلقہ ٔاثر کافی وسیع ہے ۔انہوں نے قصیدے کے مختلف اجزائے ترکیبی کے تقاضوں کو کامیابی سے پورا کیا ہے ۔ان کے قصائد میں تقریباً سبھی روایتی مضامین ملتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ان میں ندرت اور تازگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔''

(مطالعہ امیر۔ص ۲۵۶)

❑❑❑

محسن کاکوروی کی قصیدہ نگاری

اسلم مرتضیٰ

پہیا اعظم پور
ہردوئی روڈ، لکھنؤ

رابطہ: 9559043204

یحییٰ خاں نواب آصف الدولہ کے ذریعہ نوابین اودھ کی دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ میں قائم ہوئی۔ انشاءاللہ خاں انشاؔ، شیخ قلندر بخش جرأت اور غلام ہمدانی مصحفیؔ سے دبستان لکھنؤ میں باقاعدہ طور پر منظم طریقہ سے اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس طرح صنف قصیدہ کو اودھ کے دربار لکھنؤ میں داخل ہونے کا موقع ملا، مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ اور اسداللہ خاں غالبؔ جیسے استاد شعراء نے دہلی سے لکھنؤ کی جانب رخ کیا۔ اردو قصیدہ نگاری کا سلسلہ نوابین اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے عہد حکومت تک جاری رہا۔

حضرت محسنؔ کاکوروی کی ولادت نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں ہوئی، انہوں نے صرف نو برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ شاعری پر اصلاح اپنے خالہ زاد ماموں ہادی علی اشک کے سوا کسی سے نہیں لی [۱] رام بابو سکسینہ کی غلط بیانی کے سبب بعد کے تذکرہ نگاروں نے انھیں امیر مینائی کا شاگرد لکھا ہے [۲] محسن نے کل چھ قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کی سب سے زیادہ شہرت قصیدہ مدیح خیر المرسلین کی وجہ سے آج تک برقرار ہے۔ قصیدہ عربی صنف سخن ہے۔ اردو زبان میں قصیدہ گوئی کا آغاز فارسی شاعری کے زیر اثر ہوا۔ جب اردو زبان میں قصیدہ صنف داخل ہوئی تو اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اردو صنف قصیدہ کی تبدیلی میں ایک نام محسنؔ کاکوروی کا بھی ہے جس نے دبستان لکھنؤ کی شاعری کا رنگ ہی بدل دیا۔ اردو قصیدہ نگاری کے سلسلہ میں علی جواد زیدی اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ تمام سرمایہ بنیادی طور پر تقلیدی ہے اور ان سب کا سراغ فارسی قصائد میں مل جاتا ہے لیکن اردو والے ان تقلیدی مضامین میں بھی گل بوٹے کھلاتے رہے ہیں مقامی رنگ بھی بار بار ابھرا ہے''۔ [۳]

صنف قصیدہ میں جہاں ایک طرف دنیا کے مال کی خواہش میں امراء اور شہنشاہ کی مدح کی جاتی ہے وہیں دوسری جانب پیغمبر اسلام کی شان میں قصیدے کہے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں حسان الہند حضرت محسنؔ کاکوروی کو انفرادی حیثیت حاصل ہے جنھوں نے اپنی تمام شعری عمر مدح رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف کردی جس کا اعتراف انھوں نے اپنے قصیدہ مدیح خیر المرسلین میں یوں کیا ہے:

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

''کلیات نعت مولوی محمد محسنؔ'' میں حسب ذیل قصائد شامل ہیں ان تمام قصیدوں کے نام تاریخی ہیں۔ مثلاً گلدستہ کلام رحمت ۱۲۵۸ھ ابیات نعت ۱۲۷۴ھ چتر شاہنشاہی ۱۲۷۵ھ مدیح خیر المرسلین ۱۲۹۳ھ نظم دل افروز ۱۳۱۸ھ اور انیس آخرت ۱۳۲۳ھ ۔متذکرہ بالا قصائد کی تاریخ پر علی جواد زیدی کو یہ اعتراض ہے کہ ''ابوسحر محمد کو یہ تسامح ہوا ہے کہ یہ سبھی عنوانات تاریخی ہیں، تین عنوانات مدیح خیر المرسلین، نظم دل افروز اور انیس آخرت یقیناً تاریخی ہیں لیکن گلدستہ رحمت اور ابیات نعت تاریخی نام نہیں ہیں۔ ۴؎ ان قصائد کی تاریخ کو سمجھنے میں زیدی صاحب سے غلطی ہوئی ہے کیونکہ ''گلدستہ کلام رحمت ''میں کلام کو خارج کر کے تاریخ نکالی ہے۔اور ''ابیات نعت'' یہ تاریخ صنعت زبر بینہ میں ہے'' ۵؎

محسنؔ کاکوروی کی قصیدہ نگاری کا ایک جائزہ اس مضمون میں پیش ہے۔ان کے تمام قصیدوں میں قصیدہ'' مدیح خیر المرسلین'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور شاعری کی فنی خوبیاں بھی نمایاں ہوئیں۔اگرچہ فن قصیدہ گوئی میں سوداؔ کو امامت کا درجہ حاصل ہے۔قصیدے کے اہم عنصر تشبیب، گریز اور خاتمہ جس سے قصیدہ نگار کے فن کو پرکھا جاتا ہے ان تینوں چیزوں کی بدولت محسن کے قصیدے کو شہرت اور بلندی حاصل ہوئی۔قصیدہ ''مدیح خیر المرسلین'' کی تشبیب سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سروقدان گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

محسنؔ کے قصیدے کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اس نعتیہ قصیدے میں ہندوستانی رسم ورواج ، ہندوؤں کے مقدس مقامات کو مسلمانوں کے مقدس مقامات کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس قصیدہ کی تشبیب میں متھرا، گوکل، گوپیوں اور کنھیا کا ذکر ہے جس پر ناقدین کو اعتراض ہوا کہ نعت پاک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ان چیزوں کا ذکر بے موقع و بے محل ہے اس اعتراض کا جواب حضرت امیر مینائی نے اس طرح دیا ہے۔

''بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ قصیدہ نعت میں متھرا گوکل وکنہیا کا ذکر بے محل ہے لہٰذا دفع دخل کیا جاتا ہے کہ لغت میں تشبیب کے معنی ہیں ذکر ایام شباب کرنا اور اصلاح شعر میں مضامین عشقیہ کا بیان کرنا اساتذہ نے تخصیص مضامین عاشقانہ کی بھی قید نہیں رکھی کوئی شکایت زمانہ کی کرتا ہے کوئی متفرقہ مضامین کی غزل لکھتا ہے الغرض متن کلام اساتذہ و حقیقت شناسان تشبیب وقصیدہ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ تشبیب کے محصور نہیں ہیں اور نہ کچھ اس مناسبت کی قید ہے کہ حمد ونعت ومنقبت میں قصیدہ ہو تو تشبیب میں بھی اس کی رعایت رہے۔'' ۶؎

جب محسنؔ پر قصیدے کی تشبیب پر اعتراض زور پکڑنے لگا تو دوستوں کے کہنے پر انہوں نے اسی قصیدے کی زمین میں اشعار کہہ کر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کر دیا۔قصیدہ ''مدیح خیر المرسلین'' کی تشبیب میں محسنؔ نے ہندوستانی تشبیہات تلمیحات و استعارات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔شری کرشن کی داستان عشق، رومانی فضائیں، برج میں ان کے وجود کی تاثیر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا اور اردو شاعری پر عائد اس الزام کو خارج کیا کہ شعرائے اردو ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی ان کی نگاہیں عرب و ایران کی جانب لگی رہتی ہیں۔محسنؔ نے فرات ودجلہ کے بجائے گنگا جمنا اور کاشی ومتھرا کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے شری کرشن کی رومانی محبت کی کہانی سے عام ہندوستانی واقف ہے ۔اس قصیدے میں خیالات، تشبیہات واستعارات ہندوستانی فضا کی پیداوار ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

دیکھئے ہوگا سری کرشن کا درشن کیوں کر
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا نہ ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

محسنؔ کس طرح استادانہ کمال کے ساتھ مدح پر آتے ہیں۔ وہ اس قصیدے کے اشعار کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کیونکہ گریز کے لئے بے ساختگی کا ہونا اشد ضروری ہے اس لئے محسنؔ نے اس کا خاص خیال رکھا ہے:

ہاں یہ سچ ہے کہ طبیعت نے اڑایا جو غبار
ہوئی آئینۂ مضموں کی دو چنداں صیقل
روئے معنی ہے بہکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل
اک ذرا دیکھئے کیفیت معراج سخن
ہاتھ میں جام زول شیشۂ مے زیر بغل
گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں
کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل

اور خاتمہ میں بڑی قادر الکلامی کے ساتھ کہتے ہیں:

محسنؔ اب کیجئے گلزار مناجات کی سیر
کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل

اس قصیدے کا اختتام مثالی ہے اور فن کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے:

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح

ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

محسنؔ کاکوروی کا قصیدہ ''مدیح خیرالمرسلین'' پہلی نعتیہ کاوش ہے جس کی تشبیب میں جدت اور زور موجود ہونے کے ساتھ تشبیہات واستعارات خالص ہندوستانی فضا سے تعلق رکھتے ہیں۔ گنگا، جمنا، بندرابن اور بنارس کو پس منظر کے طور پر استعمال کر کے انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی تہذیب سے روشناس کرایا ہے۔

''گلدستۂ کلام رحمت''، محسنؔ کا پہلا قصیدہ ہے اس قصیدہ کو انہوں نے صرف سولہ برس کی عمر میں تخلیق کیا تھا اور اس کا آغاز بہاریہ تشبیب سے اس طرح کیا:

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن
غنچہ ہے نام خدا نافۂ آہوئے ختن
فیض تاثیر ہوا ہے کہ ہوا جاتا ہے
روکش باغ ذلیل اب کی سراپا گلشن

مذکورہ بالا قصیدہ دو مطلعوں اور باون اشعار پر مشتمل ہے جس میں گریز سے پہلے نعت شریف کے کئی اشعار ہیں۔ پورے قصیدہ میں خیالات کی پاکیزگی کی وجہ سے رومانیت کے اثرات نمایاں ہیں۔ بیان کی ندرت اور اسلوب کی تازگی نے اس قصیدے میں وہ خوبیاں پیدا کی ہیں جو ایک اچھے قصیدہ گو شاعر کے یہاں ملتی ہیں۔

''نظم دل افروز'' اس قصیدے میں محسنؔ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا پس منظر، تشریف آوری، اخلاق و عادات، معراج کا ذکر اور صحابہ کرام کی محبت کو والہانہ انداز میں بیان کیا ہے قصیدے کی تمہید کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہے منزل اک مہ کنعاں کی قلب زار و مضطر میں
یہ مہمان عزیز اترا ہے کس اجڑے ہوئے گھر میں
نہ کوئی پوچھتا ہے اور نہ ذکر اس کا ہے دفتر میں
بڑا دیوانہ ہے محسنؔ کہاں آیا ہے محشر میں

گریز میں محسنؔ نے کافی برجستہ اور دلآویز اشعار کا استعمال کیا ہے ؎

زمین شعر پر اعلیٰ مضامیں عرش اعظم سے
چلے آتے ہیں شوق مصرف نعت پیمبر میں

نقوش ایام

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'نقوش ایام نمبر' بھی شامل ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اسکی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۳۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

قصیدے کا خاتمہ حسب ذیل اشعار پر ہوتا ہے:

وہ جنت مل گئی ہے آکے تیرے آستانے سے
شمیم خلد کوچہ کی نسیم روح پرور میں
تو وہ کوکب ہے جس کا لامکاں تک نور پھیلا ہے
نہیں ہے اس شرف کا کوئی تارا آسماں بھر میں
جو تیری منزلت جو قدر ہے سرکار داور میں

محسنؔ کاکوروی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ابواللیث صدیقی اپنی تصنیف ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' میں رقم طراز ہیں:

''محسن کا کلام اس حیثیت سے قابل قدر ہے کہ اس کی بنیاد خلوص و محبت پر رکھی گئی ہے۔ محسنؔ نے اپنی شاعری کو اپنی شہرت یا صلے کا ذریعہ نہیں بنایا۔(۷)

''ابیات نعت'' اس قصیدہ کی تشبیب غزل میں عشقیہ مضامین تمہید کے طور پر نظم کئے گئے ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور پہلے مطلع میں روضہ انور کی روح کی مدح سرائی کی ہے:

لکھوں اک مختصر جملہ کہ روضہ ہے محمد کا
یہی مسند الیہ اچھا سبب ہے رفع مسند کا

دوسرے مطلع میں محسنؔ نے ''قد'' کے قافیہ کا استعمال کیا ہے ؎

تصور میں ترے جنت ہے گوشہ اپنے مرقد کا
کہ لایا میری چشم تر کا ہے طوبیٰ ترے قد کا

متذکرہ قصیدے میں محسنؔ نے اپنی شاعری کی تعریف سے ایک نئے مطلع کا آغاز کیا ہے ؎

مقابل مجھ سے کیا ہو مرد میدان سخن محسنؔ
کہ جوہر ہے مری تیغ زباں میں وصف احمد کا
زمین شعر پر نازل ہے قرآن سخن مجھ سے
کتاب آسماں اک نسخہ ہے لوح زبرجد کا

غدر ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی کے وقت محسنؔ مین پوری سے کاکوری تشریف لا چکے تھے۔ اسی درمیان حضرت امیر مینائی محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں ساری پونجی جس میں ان کی اولاد بھی شامل ہے لٹا کر کاکوری میں محسنؔ کے گھر میں پناہ لی اور کافی عرصہ کاکوری میں

قیام پذیر رہے اسی درمیان انھوں نے محسن کے قصیدہ ''ابیات نعت'' پر معرکتہ الآراء تضمین لکھی جو کلیات محسنؔ میں شامل ہے۔ ۸ جس کا تاریخی نام ''مخمس نعتیہ'' ہے۔ مولف تذکرہ مشاہیر کاکوری نے مخمس نعتیہ کو حضرت محسنؔ کی تخلیق لکھا ہے ۹ جو عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ اس قصیدہ کا اختتام دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے۔

''انیس آخرت'' اس قصیدہ کی تخلیق اس وقت وجود میں آئی جب حضرت محسن اپنی عمر کے اس حصہ میں قدم رکھ چکے تھے جہاں عشق رسول ان کی رگ رگ میں پوری طرح پیوست ہو چکا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس قصیدہ میں انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و برکات کا ذکر بڑے فنکارانہ اور عقیدت مندانہ طریقہ سے کیا ہے ؎

کہوں ایمان کی سو بار اٹھالو سر پہ قرآں کو
کوئی ثانی نہ یزداں کا نہ اس محبوب یزداں کا
وہ ہم صورت ہے معنیٰ پرور عالم کی رحمت کا
وہ ہم معنی ہے صورت آفریں کے لطف واحساں کا
شب معراج میں حق نے بلایا اس کو پاس اپنے
کیا سو طرح کا پاس اپنے محبوب اپنے مہماں کا

''چتر شاہنشاہی'' محسنؔ کاکوروی نے اس قصیدہ کو ۱۲۷۵ھ میں اودھ کے آخری بادشاہ نواب واجد علی شاہ اخترؔ کی مدح میں لکھا۔ یہ قصیدہ جب بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو نواب واجد علی شاہ نے حضرت محسنؔ کو انعام و اکرام سے نوازا۔ قصیدہ چتر شاہنشاہی مسدس کی شکل میں ہے جس کا ایک بند بطورہ نمونہ پیش ہے ؎

عزیز مصر جب تک مشتری ہو مہر قیصر ہو
قمر پرویز زہرہ مثل شیریں ناز پرور ہو
دبیر چرخ توقیعات میں کسریٰ کا ہمہ ہو
ہو کیوں ان مثل کے مریخ بہرام دلاور ہو
الٰہی جان عالم بادشاہ ہفت کشور ہو
فلک پر سات اختر ہیں زمیں پر ایک اختر اور ہو

اردو قصیدہ نگاری میں محسنؔ کاکوروی کسی قصیدہ گو شاعر سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان کے قصائد میں مضمون کی بلندی اور فکری پرواز بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ ان کے قصیدوں کا موضوع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی ہے۔ خلوص ومحبت کا اظہار اور نکتہ آفرینی ان کے کلام کی خوبیاں ہیں۔

اگر فن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو محسنؔ کاکوروی کے قصیدے سوداؔ اور ذوقؔ کے قصائد سے کسی درجہ کم نہیں ہیں۔ اردو ادب میں محسنؔ کی اہمیت وافادیت قصیدہ ''مدیح خیر المرسلین'' کے سبب آج بھی برقرار ہے۔

حوالہ جات

(۱) کلیات نعت مولوی محمد محسنؔ، مرتب نورالحسن نیر الناظر پریس لکھنؤ ۱۳۵۳ھ۔ ص ۱۱
(۲) ''ہسٹری آف اردو لیٹریچر'' رام بابو سکسینہ مطبع منشی تیج کمار پانچویں بار ۱۹۹۹ء۔ ص ۳۶۲
(۳) قصیدہ نگاران اتر پردیش علی جواد زیدی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء اتر پردیش اردو اکادمی ص ۱۰
(۴) قصیدہ نگاران اتر پردیش علی جواد زیدی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء اتر پردیش اردو اکادمی ص ۲۷۲
(۵) کلیات نعت مولوی محمد محسنؔ، مرتب نورالحسن نیر الناظر پریس لکھنؤ ۱۳۵۳ھ۔ ص ۴۸
(۶) کلیات نعت مولوی محمد محسنؔ، مرتب نورالحسن نیر الناظر پریس لکھنؤ ۱۳۵۳ھ۔ ص ۹۳
(۷) لکھنؤ کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۹۱ء۔ ص ۲۵۴
(۸) کلیات نعت مولوی محمد محسنؔ، مرتب نورالحسن نیر الناظر پریس لکھنؤ ۱۳۵۳ھ۔ ص ۴۸
(۹) تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ شاہ علی حیدر قلندر، اشاعت اول ۱۹۲۷ء ص ۳۶۸
(۱۰) نواب واجد علی شاہ کا تخلص اخترؔ

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

تدریس قصیدہ کے مبادیات

حنا آفریں

اسسٹنٹ پروفیسر

اکادمی برائے فروغِ استعدادِ

اردو میڈیم اساتذہ،

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

رابطہ: 8443871003

کامیاب اور بہتر تدریس معلوم سے نامعلوم، مانوس سے غیر مانوس اور آسان سے مشکل کے تدریسی طریقۂ کار پر منحصر ہے۔ یہ سفر تبھی آسان ہوگا جب معلم کو اس بات کی معلومات ہوگی کہ طلبا کے لیے مانوس کیا ہے؟ ان کی معلومات کتنی ہے؟ ان کی ذہنی سطح کیا ہے؟ وہ کس حد تک اپنی مشکلوں کو آسان بنا چکے ہیں؟ ان باتوں کی معلومات تبھی ممکن ہے جب معلم طلبا کی سابقہ معلومات سے نئی معلومات کو ہم آہنگ کرنے سے قبل طلبا سے گفتگو کرے، ماقبل تدریس ممکنہ جانچ اور طلبا کے نتائج سے واقف ہو۔ اس طرح معلم اپنے پڑھائے جانے والے سبق کو بامعنیٰ اور بامقصد بنا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی تدریس کے لیے معلم کا مقصد واضح ہونا چاہیے۔ مقصد کا واضح شعور تدریس کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ مقصد کو پورا کرنے کے لیے معلم کو کتنی اور کیسی کاوش کی ضرورت ہے۔ مقصد واضح ہوگا تو اسی کے مطابق معلم نصاب کی تیاری کرے گا۔ اسی کی مناسبت سے طریقۂ تعلیم کا استعمال کرے گا اور اسی کی مناسبت سے کلاس میں لیکچر کی تیاری کے ساتھ ساتھ تدریس کے ذرائع کا تعین کرے گا۔ مقصد کے واضح ہونے پر ہی معلم امتحان کا طریقۂ کار اور کاپیوں کو جانچنے کا معیار طے کرے گا۔

ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات کے سبب تعلیم کے مقاصد بھی بدلتے رہتے ہیں مگر ادب کا مقصد ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ ادب انسان کی شخصیت میں نکھار لاتا ہے اور اس کی تکمیل کرتا ہے، انسان کے احساسات کو بیدار کرتا اور غلط اور صحیح کا شعور پیدا کرتا ہے۔ ادب انسان کو نئے ڈھنگ سے دنیا دیکھنے کے ساتھ ہی اپنے احساسات و تجربات کو بہتر طریقے سے بیان کرنے کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔ ادب میں دو طریقوں سے اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک نثری پیرایے میں دوسرے شعری پیرایے میں۔ چونکہ ہر انسان باطنی طور پر ایک جمالیاتی شعور رکھتا ہے۔ اس لیے شاعری کے لیے یہ ضروری ہے کہ شاعر کے دل سے نکلی بات قاری یا سامع کے دل تک پہنچ جائے۔ انسان اپنی زندگی میں بہت سے کام نفع و نقصان کا خیال کیے بغیر دل کو تسکین پہنچانے کے لیے کرتا ہے۔ ادب یا شاعری کا سننا اور پڑھنا بھی انھی میں ایک ہے۔ شاعری میں شاعر اپنی قوتِ تخیل کا استعمال قدرتِ بیان کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس کا تخیل اور بیان جتنا خوبصورت ہوگا وہ شعر اتنا ہی اچھا تسلیم کیا جائے گا اور وہ قاری یا سامع کی جمالیاتی حِس کی نشوونما کر سکے گا۔

قصیدے کا مقصد کسی کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ہے۔ بزرگوں کی شان میں کہے گئے قصیدے سے روحانی فیض اور سلاطین وامرا کی تعریف میں کہے گئے قصیدے سے صلہ وانعام کا حصول قصیدہ گو کے پیشِ نظر رہا ہے لیکن قصیدہ پڑھانے کا مقصد محض تعریف وتوصیف کی وضاحت نہیں ہے اور نہ ہی صرف الفاظ کی پرتوں کو کھولنا ہی ہے بلکہ اس کے ذریعہ طلبا کے شعری ذوق کو بیدار کرنا بھی ہے تاکہ ان میں احساسات اور جذبات شناسی کی قوت بیدار ہو سکے اور ان میں شعروادب کی سمجھ پیدا ہو سکے۔

قصیدے کی تدریس کے لیے سب سے پہلی بات جو معلم کو ذہن میں رکھنی ہے وہ طلبا کی ذہن سازی ہے تاکہ ان کا ذہن قصیدے میں دلچسپی محسوس کرے۔ یہاں معلم کے پاس پورا موقع ہے کہ وہ طلبا کے سامنے وہ ماحول پیش کردے جو شاہی درباروں کا ہوتا تھا۔ ایسا کرنے میں طلبا پوری طرح سبق کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں گے اور اس متن میں کیا ہے یہ جاننے کے لیے ان کا تجسس بڑھ جائے گا۔ اس کے بعد معلم کو اس بات کا درس دینا ہے کہ قصیدہ کیوں کہا جاتا ہے۔ شاعر جو بادشاہ یا نواب کی مدح کرتا ہے تو اس کے پسِ پشت اس کا مقصد کیا ہے؟ قصیدے کی کتنی اقسام ہیں۔ کسی کی مدح میں کہے گئے قصیدے کو مدحیہ اور برائی یا ہجو میں کہے گئے قصیدے کو ہجویہ کہتے ہیں۔ جہاں پر معلم مدحیہ اور ہجویہ قصیدے کا ذکر کرے تو اس طرح کے اشعار کی مثالیں بھی مہیا کردے جن میں کسی کی توصیف یا ہجو بیان کی گئی ہو۔ مثلاً

مدحیہ اشعار:

آج وہ دن ہے کہ اے خسروِ والا گہر
کوہ دے نذر تجھے لعل و دریا گوہر
ہو ترے فیضِ کرم سے جو زمیں گوہر خیز
ہو نصیبِ صدفِ نقشِ کفِ پا گوہر
مشتری کہتے ہیں جس کو وہ اٹھا لایا چرخ
ٹوٹ کر جو ترے سمرن سے گرا تھا گوہر
ماہ گہنے کے لئے نہ کہ گہنے کے لئے
تیرے کنٹھے کا کہوں کیا اسے زیبا گوہر
آبِ دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب
ابرِ مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

(قصیدہ درمدح بہادر شاہ ظفرؔ از ذوقؔ)

ہجویہ اشعار:

نے دانہ، ونہ کاہ، ونہ تیارونے سیس
رکھتا ہے جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار
ناطاقتی کو اس کی کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل، زمیں سے، بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گداز
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امید وار ہم بھی ہیں، کہتے ہیں یوں چمار

(قصیدہ تضحیکِ روزگار از سوداؔ)

معلم، طلبا کو اس بات سے بھی واقف کرائے کہ بزرگانِ دین کی مدح میں کہے گئے قصیدے میں ان کی عظمتوں کا بیان، ان کے اخلاق واطوار کا ذکر اور ان سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح قصیدے کی تمہید باندھتے ہوئے معلم کو قصیدے کے فن سے آگاہ کرانا چاہیے تاکہ طلبا قصیدے کے فن سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ اگر طلبا پہلی بار قصیدے کی قرأت کر رہے ہیں تو قصیدے کے تعارف کے بعد اس کے اجزائے ترکیبی پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے کہ قصیدے میں تشبیب کا کیا مطلب ہے۔ قصیدے کے ابتدائی اشعار کو تشبیب کیوں کہتے ہیں؟ اس طرح تشبیب کے اشعار کی وجہ تسمیہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے معلم کو یہ واضح کرنا چاہیے کہ قصیدہ اردو شاعری میں عربی کے توسط سے آیا ہے۔ ادبی تخلیق کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک الہامی یعنی غیر شعوری، دوسری شعوری جو کوشش کے بعد تخلیق کی جائے۔ قصیدے کی صنف دوسری قسم میں شامل ہے کیونکہ شعری تخلیق قصد یعنی ارادے کے ساتھ شروع کی گئی۔ اس میں شاعر کے ارادے کا دخل ہے کہ کسی کی توصیف کرے۔ عرب، جنگ وجدال میں اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے عشقیہ مضامین باندھتے تھے اور رومان پرور باتیں کرتے تھے۔ اس طرح قصیدے کے ابتدائی حصے کا تعلق شباب سے تھا اس لیے اس حصے کو تشبیب سے موسوم کیا گیا۔ ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے معلم تشبیب کے کچھ اشعار طلبا کو سنائے تاکہ طلبا کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح اُتر جائے کہ تشبیب کیا ہے اور اسے تشبیب کہتے کیوں ہیں۔ معلم کو چاہیے کہ اساتذہ کے مشہور قصیدوں سے مثالیں پیش کرے۔

تشبیب کے بعد معلم، طلبا کو قصیدے کے دوسرے حصے گریز سے واقف کرائے کہ تشبیب اور مدح کے درمیان جوڑنے والی کڑی کو گریز کہتے ہیں۔ ساتھ ہی مثال دیتے ہوئے یہ بتائے کہ شاعر تشبیب سے گریز کی جانب کس طرح آتا ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں کہے گئے غالبؔ کے قصیدے کی تشبیب اور گریز کے اشعار دیکھیے کہ کس طرح سے شاعر تشبیب کے اشعار میں صبح کا منظر بیان کرتے ہوئے گریز کی جانب آتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسر و انجم کے آیا صرف میں
شب کو پھر گنجینۂ گہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو

موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
ذشاہِ روشن دل بہادر شہ، کہ ہے
راز ِ ہستی اس پر سرتاسر کھلا
وہ ، کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا '
(قصیدہ درمدح بہادر شاہ ظفرؔ از مرزا غالبؔ)

معلم کو یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ شاعر کس طرح تشبیب سے گریز اور گریز سے مدح کی جانب آتا ہے اور ممدوح کی تعریف کرنے کے لیے وہ کیسے تعریف کے نئے نئے پہلو تلاش کرتا ہے۔ شاعر کس طرح تخیل کا سہارا لے کر مضمون آفرینی کرتا ہے اور اپنے قدرتِ بیان کا زور دکھاتا ہے۔ معلم، طلبا کو اس بات سے بھی آگاہ کرائے کہ شاعر اس حصے میں ممدوح کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کس طرح کام لیتا ہے اور اپنے جوش وخروش کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے لیے شاعر کو ممدوح کے شایانِ شان ، بھاری بھرکم الفاظ اور تراکیب کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پھر معلم، طلبا کو حسنِ طلب سے واقف کرائے جس مقصد کے تحت قصیدہ گو نے خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہا ہے۔ اپنا مقصد حل ہوتا دیکھ شاعر ممدوح کو دعا دیتے ہوئے قصیدے کو ختم کرتا ہے۔ قصیدے کے فن اور اجزائے ترکیبی پر تبھی بات کرنی چاہیے جب طلبا قصیدے کی قرأت پہلی بار کرنے جا رہے ہوں۔

قصیدے کی تدریس سے پہلے شاعر اور ممدوح دونوں کا مختصراً تعارف پیش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد معلم قصیدے کے عنوان کا اعلان کرے۔ قصیدہ چونکہ مشکل صنفِ سخن ہے۔ اس کی زبان اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ و تراکیب ممدوح کی شایانِ شان ، بھاری بھرکم اور ثقیل استعمال کی جاتی ہیں۔ اس لیے ان باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے معلم کو نصاب میں شامل قصیدے کی بلند خوانی کرنی چاہیے۔ چونکہ قصیدے کی مدح کا لہجہ کبھی مدھم نہیں ہوتا اس میں ایک طرح کا طُمطراق، ولولہ اور جوش وجذبہ ہوتا ہے۔ اس لیے بلند خوانی کے وقت معلم اس طرح سے الفاظ کو ادا کرے کہ الفاظ کے زیر و بم، لہجے کے ٹھہراؤ اور آواز کی تبدیلی سے طلبا لطف وانبساط کے ساتھ یہ بھی محسوس کر سکیں کہ بادشاہوں کا دربار کیسا ہوتا ہوگا، شعرا کس طرح جی جان سے ان کی مدح لکھتے ہوں گے اور پھر اس کی پیش کش میں کیسا جادو ہوگا کہ ممدوح خوش ہوکر بڑی سی بڑی جاگیریں عطا کر دیتے تھے۔ اگر معلم نے بہتر طریقے سے بلند خوانی نہیں کی ہے تو تدریس سے دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے معلم کو کوشش کرنی چاہیے کہ قصیدے کی تدریس کے وقت وہ موثر انداز میں صحیح تلفظ کے ساتھ بلند خوانی کرے۔ اس کے بعد معلم طلبا سے بلند خوانی کروائے اور سوالات بھی قائم کرے تاکہ تدریس کے وقت ان کی شمولیت رہے۔ چونکہ قصیدے کے مزاج اور مقصد کے مطابق اس میں الفاظ پُرشکوہ، دقیق اور کبھی کبھی نامانوس بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس لیے معلم کو مشکل الفاظ وتراکیب کے معنیٰ بیان کرنے میں زیادہ مستعدی سے کام لینا چاہیے اور انھیں تختۂ سیاہ پر بھی لکھ دینا چاہیے تاکہ طلبا الفاظ کے صحیح تلفظ اور ہجے سے واقف ہو سکیں۔ درس گاہ میں جانے سے قبل معلم کو الفاظ، تراکیب، بلند خیالی اور مبالغہ وغیرہ سے متعلق ضروری باتوں پر غور کر لینا چاہیے۔

اس کے بعد قصیدے کی تفہیم کا مرحلہ آتا ہے۔ قصیدے میں نہ تو غزل کی مانند ہجر و وصال کی کیفیات بیان ہوتی ہیں اور نہ ہی مثنوی کی مانند کوئی قصہ ابتدا سے انجام تک نمو پذیر ہوتا ہے اور نہ ہی مرثیے کے مانند اس میں شہدائے کربلا کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ قصیدے میں سارا دارومدار الفاظ اور اس کی زبان وبیان پر منحصر ہے۔ اس لیے اس کی تفہیم اس طرح کرنی چاہیے کہ قصیدے میں مستعمل تمام محاسن طلبا پر واضح ہو جائیں اور وہ ان کی فنی نزاکتوں کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں۔ ساتھ ہی الفاظ کا طمطراق اور فنی زوران کی طبیعت پر گراں بھی نہ گزرے۔

قصیدے کی تفہیم کے وقت اگر کسی کا ہم خیال کوئی دوسرا شعر یاد آجائے اسے بھی معلم بیان کر دے تاکہ وہ شعر قصیدے کی تفہیم میں طلبا کے لیے مددگار ثابت ہو سکے۔ جب مکمل طور پر قصیدے کی تفہیم ہو جائے تو معلم، طلبا سے قصیدے کے متعلق سوالات کرے اور طلبا کی جانب سے ملنے والے جواب سے وہ اس بات کا اندازہ لگائے کہ طلبا نے قصیدے کو کس حد تک سمجھا ہے۔ طلبا کو کچھ وقت کے لیے خاموشی سے قصیدے کے متن کا مطالعہ کرنے کے لیے کہنا چاہیے تاکہ وہ اس کی تفہیم خاموش خوانی اور غور وفکر کے ذریعہ کر سکیں۔ معلم، طلبا کو یہ بات بھی بتا دے کہ اگر انھیں قصیدے کی تفہیم میں کوئی مشکل پیش آرہی ہے تو معلم اس مشکل کو آسان کریں گے۔ اگر کوئی طالب علم درمیان میں سوال کرتا ہے تو معلم کو اس کا جواب دینے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ آخر میں معلم ایک بار پھر مختصراً قصیدے کا مفہوم پیش کرے اور اس طرح قصیدے میں کہی گئی بات طلبا کے ذہن نشیں ہو جائے گی۔ پھر طلبا کو گھر کے کام کے لیے کچھ سوالات کے جوابات لکھ کر لانے کے لیے کہنا چاہیے تاکہ لکھنے میں بھی ان کی مشق ہو سکے۔

اس طرح یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ قصیدہ کی تدریس، شاعری کی دوسری صنفوں کے مقابلے زیادہ توجہ اور احتیاط کا تقاضا رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ایسی صنف ہے جو موجودہ عہد کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ساتھ ہی اس کی زبان، اس کا بیان اور اس کا لہجہ بھی ایسا پُرتکلف ہوتا ہے کہ معلم کو ماقبل تدریس لغات اور دوسری معاون کتابوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

□□□

اردو قصیدہ نگاری: ایک اجمالی جائزہ

ڈاکٹر زیبا محمود

صدر شعبۂ اردو
گنپت سہائے پی جی کالج
سلطانپور
رابطہ: 7007290966

تمام اصناف سخن میں قصیدہ نگاری جس نے اپنی تمام تر عظمتوں، رفعتوں کے ساتھ وقت کی تند و تیز لہروں میں موجزن کبھی دربار کی شان و شکوہ کا مظہر تو کبھی رؤساء و امرا کے جاہ و جلال کو اپنے قالب میں ڈھالتا رہا ہے لیکن بعد کے قصیدہ گو شعراء حضرات نے تشبیب و گریز کے مصنوعی طرز کو نہ صرف ختم کیا بلکہ مبالغہ اور شکوہ و الفاظ کی روایت کو ٹھکرا دیا۔ اس طرح عروضی ساخت میں موضوع کی عمومیت آئی اور یہ نظم جدید کی مختلف ہئیتوں میں ممتاز صنف قرار دی گئی۔ لیکن قصیدہ کو صرف عروضی ترکیب کہہ دینا بددیانتی ہے کیونکہ اصل میں قصیدہ سے ایک خاص عروضی تصور وابستہ ہے۔ جس میں تشبیب و گریز کی پابندی کے ساتھ اردو زبان و بیان کے شکوہ و طمطراق کا لحاظ اشد ضروری ہے۔

درباری اور مذہبی دونوں قسم کے قصیدوں میں شعراء اپنی سخن دانی اور علمیت کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے اور اس طرح، مذہبی قصیدوں سے مذہب کا بھی حق ادا ہونے کے ساتھ ساتھ خلاق کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔

صنف قصیدہ تمام تر اصناف سخن میں ایک باوقار صنف ہے۔ عرب کے نزدیک شاعرانہ کمال اسی پر محیط تھا اور فارسی قصیدہ نگاروں نے اسے رفیع و وقیع بنایا۔ قصیدہ ہماری تہذیبی دور کے خاص اسلوب کا عکاس ہے۔ یہ صرف نری مداحی تک محدود نہیں رہا بلکہ وقت کی برق رفتاری کے ساتھ نعتیہ، بہاریہ، وصفیہ، مذہبی اور اخلاقی موضوعات بھی قصیدے میں شامل ہوئے ہیں۔ شان طمطراق اور رعب و جلال اس دور کی تہذیب کا خاص جزو تھا۔ اصل میں مدح کے جذبات مخلصانہ نہیں ہوتے اور مدح ہی قصیدہ کا بنیادی عنصر ہے اس میں مبالغہ و اغراق سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے باوصف قصیدہ کو کو محض مدح گستری تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ قصیدے کو مختصر کر دینے کا انداز استعجاب ضرور پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس قصیدے کی ہیئت، غنائیت کی ایک پر کیف فضا کا احساس طاری کرتی ہے۔

قصیدہ کی ادبی و فنی حیثیت اظہر من الشمس ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں جو چشمک بڑھی اس کا سیدھا اثر قصیدہ پر بھی ہوا۔ اس کے باوجود دبستان لکھنؤ کے آخری دور میں قصیدہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر محمود الٰہی فرماتے ہیں:

''دبستان لکھنؤ کے بالکل آخری دور میں قصیدہ نگاری ایک تحریک کی صورت میں پروان چڑھنا شروع ہوئی۔۔۔اسالیب میں تبدیلی کی اور علمیت اور ہمہ دانی کے ایسے نقش و نگار بنائے کہ دبستان لکھنؤ کو اس صنف پر فخر کرنے کا موقع ملا۔اس دور کے قصیدے اسالیب اجزائے ترکیبی اور زبان و بیان کے لحاظ سے پرانی روش سے الگ ہوتے نظر آتے ہیں''

(بازیافت،مرتبہ زیبا محمود۔ص ۱۸۱۔۱۸۰)

قصیدے کے لغوی و اصطلاحی معنی اور اس کی وجہ تسمیہ پر ناقدین وقت نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔''تاریخ قصائد اردو'' میں مولانا جلال الدین احمد جعفری رقم طراز ہیں:۔

''اہل لغت نے قصیدے کے لغوی معنی سطبر (دلدار گودا) کے لکھے ہیں اور اصطلاح شاعری میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں مدح یا ذم یا وعظ و نصیحت یا حکایت و شکایت وغیرہ موزوں ہوں۔وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ اس میں ایسے مضامین عالی وکثیر مندرج کئے جاتے ہیں جو طبعی مذاق کے لئے لذت بخش ہوتے ہیں۔اس واسطے اس کو قصیدہ کہتے ہیں''

(بحوالہ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ از پروفیسر محمود الہی ص ۲۸۔۲۷)

''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام'' میں پروفیسر الیف کرینکو کا مطالعہ قابل غور ہے۔لکھتے ہیں:۔

''قصیدہ اور(بعض حالات میں)قصیدہ عربی (فارسی اور ترکی وغیرہ)منظومات کی ایک صنف کا نام ہے جو کسی قدر طویل ہو۔یہ لفظ عربی مادہ ''قصد'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ارادہ کرنا۔''

(اردو قصیدہ نگا رکا تنقیدی جائزہ از پروفیسر محمود الہیٰ ۳۲۔۳۱)

دراصل قصیدہ شعر کی ایک عروضی ترکیب ہے جس میں مطلع کے ساتھ ساتھ ہر شعر کا آخری مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔قصیدہ میں اشعار کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض کے نزدیک جب اشعار کی تعداد سات تک پہنچ جائے تو اس پر قصیدہ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔اور بعض نے دس اشعار سے زائد نظم کو قصیدہ مان لینے کو جائز سمجھا ہے۔اردو میں امداد امام اثر نے قصیدہ کے لئے اکیس اشعار لازمی قرار دئے ہیں۔ساخت کے اعتبار سے قصیدہ کی شکل اردو غزل سے مماثل ہے یعنی مطلع اور پھر ہر شعر کا دوسرے مصرع کا ہم قافیہ ہونا۔اسی لئے جن نظموں میں کسی کی مدح یا ہجو بیان کی گئی ہے ان تمام نظموں کو محض ان کے مضامین کی بنا پر (قصیدہ کا عروضی ڈھانچہ نہ ہونے کے سبب) قصیدہ نہیں تسلیم کیا گیا۔

اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے قصیدے کی دو قسمیں مشبث اور مقتضب ہیں۔اول الذکر میں تشبیب کے ساتھ گریز کی پابندی عائد ہے۔آخر الذکر اس پابندی سے عاری ہے۔یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ مذہبی اور درباری قصیدوں میں حسن طلب کا دعائیہ حصہ بھی ہوتا ہے۔عربی میں پروفیسر محمود الہی کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے منظوم شاعری میں قصیدہ کا استعمال عمرو بن کلثوم نے اپنے مشہور فخریہ قصیدہ میں کیا ہے۔

الہی بنی تغلب عن کل مکریۃ
قصیدہ قالہا عمرو بن کلثوم

چونکہ اردو شاعری کا آغاز دکن میں ہوا اس لئے اردو میں قصیدہ گوئی کی اولیت کا شرف بھی دکن کو ہی حاصل ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ دکن کے بعض قصیدے معرکتہ الآرا اور عظیم الشان بھی ہیں۔لیکن اب ان قدیم دکنی قصائد کی تاریخی اہمیت زیادہ اور ادبی اہمیت نسبتا بہت کم ہے۔ادبی لحاظ سے قصیدہ کے ارتقا و عروج کا دوسرا دور سوداؔ سے شروع ہو کر ذوقؔ پر ختم ہو جاتا ہے۔شمالی ہند میں شاعری کے دور اول میں قصیدہ نگاری کی طرف کوئی رجحان نہیں ملتا مگر متقدمین کے طبقہ دوم میں مرزا سودا نے بڑے معرکے کے قصیدے لکھے جو اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں قدر اول کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔

سر سید تحریک سے ابھرنے والے شعرائے کرام شاعری کو مشرقی طرز شاعری سے نجات دلانا چاہتے تھے وہ ادب میں اصلاح کے حامی تھے۔خواجہ الطاف حسین حالی کی آواز پر تمام خلاقوں نے لبیک کہا اور قدیم و جدید ادب کی بہت تیز رفتار مگر پر امن آویزش پروان چڑھنے لگی یہی وہ دور تھا کہ اس عہد کے ابھرتے ہوئے فنکاروں نے دہلی اور لکھنؤ کے ادبی گہواروں کو چھوڑ ،رامپور،حیدرآباد اور دوسری چھوٹی بڑی ریاستوں میں توسل حاصل کرنے کی کوشش کی جن میں امیر مینائی ،داغ دہلوی اور جلال وغیرہ کا شمار اس دور کے اچھے اور معیاری شاعروں میں کیا گیا۔ان فنکاروں نے درباری اور مذہبی دونوں قسم کے قصیدے کہے لیکن ان کی شاعری درباری ماحول کی ہی اسیر رہی۔

غدر سے پہلے شاعر کو شاعر کہلانے کے لئے امراء وسلاطین کے رجحانات کا احترام کرنا اشد ضروری تھا اور غدر کے بعد بھی یہ صورت حال کسی حد تک باقی رہی۔ دوسری طرف عوامی رائے کے تحت احترام و عقیدت پیش کرنے سے بھی شاعر صحیح معنوں میں شاعر کہلاتا تھا۔اس طرح ارباب شعر و ادب کے دو گروہ بن گئے۔ایسی فضا میں درباری قصیدہ گوئی کا عوامی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔قصیدہ جو اب تک تمام اصناف سخن میں ایک مسلمہ اور ممتاز ادبی حیثیت کا حامل تھا اب ریاستوں کی چہار دیواری کے حصار میں تھا۔حالی کی تحریک کے بعد اظہار فضل و کمال کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔اس لئے جن شاعروں کو واقعی اپنی فطری مذہبی عقیدت کا اظہار کرنا تھا انھیں قصیدہ کے علاوہ دوسری اصناف کی طرف رجوع ہونا پڑا۔

حالی کی تحریک انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ

اصلاحی بھی تھی، انھیں قصیدے کو ختم نہیں کرنا تھا بلکہ مدح کا جو مبالغہ آمیز انداز تھا اسے سچی تصویر کا آئینہ دار بنانا تھا۔ان کی کوشش تشبیب و گریز کی روایت میں فطری شاعری کا نمونہ پیوست کرنا تھی ۔دور جدید کے علمبرداروں میں بھی قصیدہ نگاری ایک حد تک باقی رہی ۔حالی اور ان کے رفقاء نے بھی قصیدے میں طبع آزمائی کی۔مگر اس تحریک کے انقلابی عناصر کی برق رفتاری نے اصلاحی پہلو گرفت میں زیادہ لئے اور تشبیب و گریز کو مصنوعی اسلوب قرار دیا۔دوسری طرف حالی قصیدوں میں جوش اور سچے ولولے کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں ۔حالی کا قصیدوں کے تئیں بھی اصلاحی نقطہ نظر تھا۔انھوں نے مدح اور ذم کے اصول راستی اور انصاف و عقل پر قائم کئے اور قصیدہ میں قومی شاعری کا رجحان پیش کیا۔ان کے نزدیک اچھا قصیدہ وہی ہے جو اسلاف کے کارناموں ان کے ہنر اور اخلاق کو متعارف کرائے۔حالی نے قصیدے کی اہمیت و افادیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔

''قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح اور ذم کے لئے جائیں اور اس کی بنیاد محض تخلیقی مضامین پر نہیں بلکہ سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔اور بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبک دوش نہیں ہوسکتا''۔

(مقدمہ شعروشاعری ص ۲۶۰)

حالی کے اکثر قصیدے مدحیہ ہیں۔ان کے قصائد کی کل کائنات میں دو نعتیہ قصیدے اور تین قصیدے نواب سر آسمان جاں ملکہ وکٹوریہ اور نظام دکن کی شان میں ہیں۔ایک قصیدہ نظام دکن کی مدح میں حیدرآباد کے جلسہ عام میں پڑھا گیا اور ایک قصیدہ الغاثیہ یا عرض حال دربار نبوت کے لئے ۔نعتیہ قصیدے میں زور بیان کے ساتھ سوز و گداز کے عناصر سے مملو، تشبیب میں فخریہ مضامین قلمبند ہیں جس میں مذہبی خلوص اور جوش عقیدت بھی ہے۔آنحضرتؐ سے انھیں جو شیفتگی محبت اور عقیدت تھی اس کا اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے:۔

''بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لئے
سخن زباں کے لئے اور زباں دہاں کے لئے
ہلال مکہ کا ،ماہ دو ہفتہ یثرب کا
فروغ قوم کے اور شمع دو زماں کے لئے
گھر اس کا مورد قرآں و مہبط جبریل
در اس کا کعبہ مقصود انس و جاں کے لئے
سپہر گرم طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لئے

(حالی ایک عہد ساز فنکار۔از ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد ۱۵۲۔۵۳)

نا تمام قصیدوں کے زمرے میں حالی کا ایک قصیدہ سرسید کی نذر ہے جس میں قوم کی حالت زار کا یوں نقشہ کھینچا گیا ہے۔:

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے
اس پر بھی اے عزیزو ہے جائے فخر تم کو
دینوں میں دین بیضا حق نے تمہیں دیا ہے

(حالی ایک عہد ساز فنکار از ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد ص ۵۴۔۱۵۳)

حالی نے انگریزی حکام اور والیان ریاست کی جگہ جگہ خاطر پذیرائی بھی کی ہے۔ان کی انصاف پسندی اور اعلی انتظامی صلاحیت کی مدح سرائی میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دل عالم کو مسخر
بند اپنے فرائض میں مسلماں ہے نہ ہندو
معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں مندر
وہ دور تعصب تھا یہ ہے دورہ انصاف
وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

(حالی ایک عہد ساز فنکار از ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد ص ۱۵۵)

الغرض حالی نے اشخاص کی سچی مدح کی طرف توجہ کی اور لفاظی کی جگہ زمانے کے بعض اہم تقاضوں سے قصیدہ کو ہم آہنگ کر کے قومی مقاصد کے لئے کارآمد بنانے پر زور دیا۔مواد ہیئت اپنے سادہ اسلوب اور اپنی حقیقت نگاری کی وجہ سے اردو قصیدہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔جس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔محمد حسین آزاد کو جدید نظم کا نقاش اول قرار دیا جاتا ہے ان کے ادبی مقام متعین کرنے میں ان کے قصیدوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔علامہ شبلی نعمانی بیدار ذہن کے مالک تھے۔شبلی نے فارسی قصیدے کے ایک بڑے حصے کو قابل قدر نہیں سمجھا ۔در اصل وہ قصیدے سے قومی بیداری اور حب الوطنی کی پیغمبری کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔مداحی کو وہ کارآمد مانتے ہیں بشرطیکہ اس میں صداقت اور راست بیانی سے واسطہ ہو۔ان کے قصیدے کا انداز بیان مسلمانوں کے شاندار ماضی سے پر کارناموں پر محیط ہے جس سے غور و فکر کی دعوت ملتی ہے۔دراصل شبلی کی مداحی کے پس پردہ ایک متحرک نظام حیات کی حکمرانی ہے جسے نعرہ رجز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اور یہ نعرہ رجز کے ساتھ وہ اپنے قصیدوں میں تشبیب و گریز کی پابندی کے ساتھ قوم کو حفظ خودی اور عرفان نفسی کی تلقین بھی کرتے ہیں ان کا قصیدہ:۔(بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسہ جیسا۔جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا) میں قصیدہ نگاری کی ساری خصوصیات ملتی ہیں،کلیات شبلی میں سید سلیمان ندوی نے شبلی کے اس ترکیب بند کو جو''بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب و ساماں میں'' قصیدہ بتایا ہے۔حالانکہ یہ قصیدے کی عروضی ترکیب میں نہیں ہے۔اس قصیدے کے اواخر میں شبلی کا یہ استفہامیہ

انداز قابل غور ہے۔

اے حریفو! تمہیں خالق کی قسم سچ کہنا ہے
شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا؟

دراصل شبلی نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ نئے دور میں بھی قصیدے کی ضرورت ہے اور نئے دور سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔اس کے علاوہ خلف سرسید کی شادی پر تہنیتی قصیدہ پیش کرتے ہیں اس قصیدے کی بہار یہ تشبیب میں ترنم اور تغزل کی چاشنی کی مثال پیش ہے:۔

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل
چھا لیا سبزہ نو خیز نے سب دشت و جبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر باد بہار
جھومتے آتے ہیں پھر صحن چمن میں بادل
جھومتی چلتی ہے بے خود روشوں پر جو نسیم
غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل
اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا
نیند میں سبزہ خوابیدہ کے آئے نہ خلل

شبلی نے فرد، جماعت اور تحریکات کی مدح کا جو انداز پیش کیا اس میں تشکر کا پہلو قابل غور ہے۔

گرچہ مدح امراء میں نے نہیں کی ہے کبھی
شکر احسان مگر فطرت انسانی ہے

شبلی کی حالی سے اثر پذیری کی نوعیت ان کے فارسی قصیدوں میں موجود ہے جس میں وہ پیروی مغرب کی ترغیب دیتے ہیں۔

جادہ مغربیاں گیرکہ ایں طرز نوی
دل پذیر است و دل آویزو دل آرا ماند
راستی ورز چناں پیکر گفتار آرے
کہ فروغ از اثر نا صیہ پیدا ماند

(دیوان شبلی فارسی ص ۲۲)

کلیم الدین احمد کی بعض آوازیں صور اسرافیل ثابت ہوئیں ۔کلیم الدین احمد کو اردو شاعری کے اصناف پر ہی بنیادی اعتراض تھا۔ یہ معاملہ صرف غزل کا ہی نہیں بلکہ قصیدہ، مثنوی قطعہ، اور رباعی سے بھی وہ مطمئن نہیں تھے۔ان کو مشرقی ادبیات کے تمام اصناف میں فنی خامیاں نظر آئیں ۔صنف قصیدہ کے بارے میں حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں جو لکھا، کلیم الدین احمد نے اپنے لہجے میں اسے دوہرایا لیکن صنف قصیدہ کے ایک پہلو سے ضرور وہ متاثر نظر آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس میں کہیں کہیں تسلسل یا ارتقائے خیال کا لحاظ رکھا گیا ہے۔انھوں نے میر، مومن، غالب کے قصائد سے بعض اشعار نقل کئے ہیں اور ان کی تعریف بھی کرتے ہیں مگر تعریف کا سبب زیادہ یہ ہے کہ جو عناصر قصائد کی خوبیوں میں شمار ہوتے ہیں وہ ان میں نہیں ہیں۔غالب کے قصیدے ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ مثال اپنے رنگ کی ایک ہی چیز ہے لیکن چونکہ قصیدہ کی عام ڈگر سے ہٹ کر ہے اس لئے اس کی طرف کچھ توجہ نہ ہوئی اور کسی نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا اور اس نئی راہ پر رہروی نہ کی۔۔۔کسی نے یہ نہ سوچا کہ یہاں قصیدہ کے محاسن نہ سہی شاعری کے محاسن تو ہیں جن سے عموما قصیدے خالی ہوتے ہیں۔انھیں تو بس یہ سوچکر نظر انداز کر دیا گیا کہ انھیں قصیدہ کہنا غلط ہے۔اسی سے ظاہر ہے کی نقالی سے ایسی طبیعت خوگر ہوگئی تھی کہ نئی چیزیں سامنے آتی تھیں تو بھی ان کی طرف آنکھ نہیں اٹھتی تھی''۔

(اردو شاعری پر ایک نظر جلد اول ص۔۲۵۶)

کلیم احمد نے سودا کے ہجویہ قصائد پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

''ان ہجویہ نظموں میں سودا کے قصیدوں سے زیادہ تنوع ہے۔۔۔قصیدہ کی شان و شوکت یہاں نہیں لیکن ایک دلکش سادگی ہے الفاظ سیدھے سادے صاف اور مانوس ہیں۔تمام آمد و بے ساختگی ہے۔زور و شور وہی ہے جو قصیدے میں ہے۔وہی روانی وہی خیالات و نقوش کی فراوانی تنوع اور اثر زیادہ ہے۔بہر کیف یہ نظمیں قابل قدر ہیں اور اردو میں یہ اپنے مخصوص رنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتیں''۔

(کلیم الدین احمد شخصیت اور تنقید نگاری۔از ڈاکٹر زیبا محمود ص ۹۸)

ان اصناف پر کلیم الدین کے افکار سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حالی کی مقدمہ شعروشاعری کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔یعنی حالی نے جو باتیں زیر لب کہیں تھیں کلیم الدین احمد نے انھیں ببانگ دہل مثالوں کے ساتھ پیش کر دیا۔اردو ادب میں مغربی ادب اور نئی سیاست اور سماجی رد و قبول سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا۔یہ ضرور ہے کہ روایتی ادب کے دوش بہ دوش جدید ادب اپنی خاص افادیت کے ساتھ افق اردو پر چھا گیا لیکن اس انقلابی تبدیلی نے اصناف شعر غزل، مرثیہ، مسدس اور نثر نگاری کے ساتھ صنف قصیدہ کو بھی متاثر کیا ۔حقیقت تو یہ ہے کہ اس تبدیلی نے سب سے زیادہ صنف قصیدہ پر منفی پر اثر ڈالے اور غزل سے بھی زیادہ قصیدہ کو ہدف ملامت بنایا گیا۔پہلے امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں اس پر سخت تنقید کی تو مولانا حالی نے اپنے مسدس میں یہاں تک کہہ دیا کہ

یہ شعر و قصائد کے ناپاک دفتر
عفونت میں سڑاس سے جو ہیں بدتر

اس اجمالی جائزہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کچھ ایسے بنے جو قصیدہ کے لئے سازگار ثابت نہیں ہوئے مزید برآں قصیدہ پر سخت تنقیدوں کا اثر یہ ہوا کہ قصیدہ بحیثیت ایک آزاد صنف زوال پذیر ہوتا چلا گیا اگر چہ باعتبار مضمون قصیدہ آج بھی زندہ ہے اور اس میں اب بھی بوقلمونی اور تنوع باقی ہے۔

❑❑❑

اشعار میں رجحان توارد

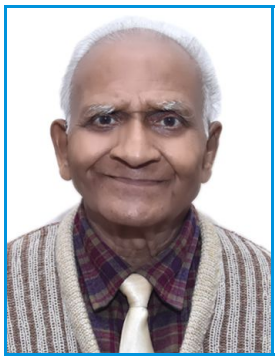

کرشن بھاؤک

201-A، گلی نمبر 18-K
گرونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)
رابطہ: 9988455210

اردو شاعری کی طویل تاریخ میں شعرا صاحبان نے مختلف موضوعات پر خرمہ فرسائی کی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے بسا اوقات ایسے اشعار کی بھی تخلیق ہو جاتی رہی ہے، جس کی بنا پر انکے خالق شاعر پر سرقہ یا نقل کا بھی الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں اس ناچیز کا فقط اتنا ہی کہنا ہے کہ موضوعات کا فقدان ہونے کے احساس سے ہی اگر کوئی شاعرِ خاص اپنے ہمعصر یا پھر اپنے سے پرانے کسی بھی چھوٹے یا بڑے شاعر کا کوئی شعر پسند آ جانے پر اگر اسی شعر سے ایک یا دو چار لفظ مستعار لے کر کسی یکسر نئے شعر کی تخلیق کر دیتا ہے، تب نہ تو اسے شعری ضابطے کے بموجب 'تضمین' یا پھر 'خمسہ' کرنے کے روایتی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہم اسے سراسر نقل کے الزام سے بدنام ہی کر سکتے ہیں۔ بااین ہمہ کلی طور پر یہ ایک متنازع فیہ موضوع ہی ٹھہرتا ہے۔ ہماری رائے میں اسے کسی بھی شاعر کی قوتِ آخذہ بھی علی الاعلان کی جا سکتی ہے۔ یہ تجویز یہاں ذاتی سطح پر پہلی بار ہی دی جا رہی ہے۔ مستزاد، یہاں اسی موضوع کی اہمیت و افادیت کے موجب ایک وسیع مطالعہ کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے، کیونکہ یہ دورِ حاضر کی شعری تنقید اور تحقیق کا ایک فوری تقاضا گردانا جا سکتا ہے۔ چونکہ سات آٹھ شعری مجموعوں کے خالق جناب بی۔ ایس۔ جین جوہر کی شاعری میں تقریباً سوَ سے زائد خیالات اسالیب کے توارُد کی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں، فقط اسی کے موجب انکے اشعار مقابلتاً دوسرے شعرا کے زیادہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس موازنے کو صحیح پیرائے میں ہی لیا جائے گا اور اس علاقے میں انہیں نمائندہ تصور کر لیا جائے، تو کچھ بھی مضائقہ نہ ہوگا۔ میری دانست میں تو اس سے شاعر کی قوتِ آخذہ ہی مقوی، مثبت اور مستند ٹھہرتی ہے۔

عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مرزا غالبؔ، میر تقی میرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مرزا داغؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبالؔ، جگرؔ مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری، فیض احمد فیضؔ، مجروحؔ سلطانپوری، شکیلؔ بدایونی، ساحرؔ لدھیانوی، احمد فرازؔ، بشیر بدر وغیرہ قدیم و جدید بیشتر شعرا نے ایک دوسرے کے اشعار سے متاثر ہو کر وقتاً فوقتاً خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں ایک سے زیادہ زبانیں جاننے والے شعرا دیگر زبانوں کے شعری مصرعوں سے بھی اپنی شاعری کی زلفیں یا پھر نوک پلکیں سنوارتے رہے ہیں۔ یہ تخلیقی کام کرتے ہوئے ان میں وہ اپنے طرفہ تخیل کی پرواز (بقول اقبالؔ ''تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا، ترے سامنے آسماں اور

بھی ہیں‘‘) سے پرانے شعر میں اپنی جانب سے حتیٰ الامکان قوسِ قزح کے گوناگون رنگ بھرتے رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے کبھی تو انکا تخلیق شدہ نیا شعر پرانے شعر کے مقابلتاً کمزور پڑ جاتا رہا ہے اور کہیں بیشتر ذہانت و لیاقت پر ایک ایک پختہ مہر لگاتے ہوئے اس سے بھی توانا اور احسن ہو کر زبان زد ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں اس تنقید کے ہی بموجب مقبولِ عام اور اپنے پسندیدہ معدودے چند اشعار کو مختلف عنوانات کے تحت پیش کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔

ا۔ سنسکرِت اور ہندی وغیرہ زبانوں سے ترغیب و تحریک:

عالم و فاضل شعرا نے نہ صرف بقول داغؔ ’سارے جہاں میں دھوم مچانے‘ والی اپنی اردو زبان کے علاوہ فارسی و عربی جیسی زبانوں کی شاعری سے بھی الفاظ و مفاہیم تک کو بڑی دانش کے ساتھ مستعار کیا ہے۔ مستزاد، انہوں نے سنسکرِت جیسی زبانوں کے بھی عمدہ شعری فقروں یا چند ایک الفاظ کو اپنے اشعار میں مستعمل کرتے ہوئے اردو زبان کو بھی مواد و اسلوب کی بے پناہ دولت سے مالا مال کیا ہے۔ مثلاً علامہ اقبالؔ نے اپنے ایک شعر میں سنسکرِت زبان کے ڈرامہ نگار و کوی **شری بھرتری ہری** کے ایک شتک (جسمیں سوَ پدَ ہوا کرتے ہیں) کا وہ میں درج ایک نہایت ہی احسن خیال کو بنیاد بنا کر یہ ایک ایسا شعر تخلیق کیا تھا جس کا شمار انکے بہت اعلیٰ و ارفع اشعار میں ہوتا ہے:۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر 1

اس شعر کا نایاب اور سیر حاصل مفہوم یہ ہے کہ ’’اگرچہ ایک گُل کے برگ سے ہیرے جیسی سخت شے کو بھی کاٹا جا سکتا ہو، تاہم کسی احمق شخص پر نرم و نازک کلام کا کوئی بھی اثر نہیں پڑا کرتا ہے۔‘‘

اب علامہ اقبالؔ کا یہ شعرِ خاص جن جدید شعرا کے اشعار کا محرک بنا ہے، ان میں سے معدودے چند ایک کے نام اور شعر آگے درج ہیں:۔

الف: ہُنرؔ رسولپوری کا شعر:

اس دور میں جینے کا ہنر دیکھ لے کوئی
آئینے سے پتھر کا جگر کاٹ رہا ہوں

ب: **عمران عظیم** کے اس شعر سے بھی موازنہ کریں:۔

لہجے میں عظیم اسکے ہے کس عطر کی خوشبو
وہ پھول کی پتی سے جگر کاٹ رہا ہے

ان تینوں اشعار میں پھول کی پتی کے ذریعے بالترتیب ہیرے کا جگر اور آئینے سے پتھر کا جگر کاٹنے سے بھی آگے بڑھ کر بلا واسطہ جگر ہی کاٹنے کے مشابہہ خیالات لائقِ غور و خوض ہیں۔

ج: چند برس قبل ساہتیہ اکادمی (نئی دہلی) سے اعزاز یافتہ شاعر **منور رانا** کا یہ شعر قابلِ موازنہ ہے:

یہ فن کوئی فقیر سکھائے گا آپ کو
ہیرے کو ایک پھول کی پتی سے کاٹنا

کسی ادیب نے سنسکرِت زبان کے مہا کوی بھرتری ہری کے شلوک کا ترجمہ نثر میں ان الفاظ میں کیا تھا۔ ’’(ہر چند) اگر کنول کی نازک ڈنڈی سے ہاتھی کو باندھا جا سکتا ہو اور، ہیرے کو بھی سرسوں کی پتی سے بیندھا جا سکتا ہو، نیز شہد کی ایک بوند سے کھارے سمندر کو بھی میٹھا کیا جا سکتا ہو، تاہم مردِ نادان کو میٹھی باتوں سے رام کر لینا قطعی آسان نہیں ہے۔‘‘ یہاں ایک احمق شخص کی بے حرمتی کرنا ہی مقصود ہے۔

امتیاز الدین خاں جیسے عالم و فاضل ناقد و شاعر نے اپنے مضمون زیرِ عنوان ’’**سنسکرِت کا شاعرِ اعظم بھرتری ہری**‘‘ میں متذکرہ بالا ترجمے کے ایک لفظ ’سرسوں‘ پر واجب سوال اٹھاتے ہوئے یہ خیال رقم کیا تھا۔ ’’اصل شلوک میں لفظ ’**سریش**‘ کا ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنی ’سِر س‘ یا ’سِر سا‘ ہیں۔ یہ شیشم کی طرح کا ایک درخت ہے، جسکے پھول میں پنکھڑیاں یا پتیاں نہیں ہوتی ہیں۔ اس میں نہایت ریشمی ریشے ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے ’سِر س‘ (سنسکرِت لفظ ’شِرش‘) کا پھول نازک ترین تصور کیا جاتا ہے۔ تُلسی داس نے بھی ’شری رام چرِت مانس‘ (ہندوؤں کا صحیفہ) میں سِرس سُمن کی نزاکت کا ذکر کیا ہے۔‘‘

مستزاد، اسی مقالے میں متذکرہ بالا ناقد و شاعر نے بھرتری ہری کے نایاب خیال کو ان شعری الفاظ میں یوں قلم بند کیا تھا :۔

کیا کمل کی نال نے باندھا ہے فیلِ بے لگام
شہد کی ایک بوند سے کھارا سمندر ہو قوام
کیا سِرس کے پھول سے بندھا گیا ہیرے کا دِل
کیا کرے گا رام ناداں کو بھلا شیریں کلام؟

اصل میں سنسکرِت زبان کے بلند پایہ و مایہ ناز کوی نے ’شِریش‘ Shireesh نام کے گُل کی خاصیت بتاتے ہوئے نادان و احمق شخص پر ہی ایک ترش طنز کیا تھا۔ علامہ اقبالؔ کے مستعمل فقط اِس ایک شعر سے ہی انکی دور اندیشی اور قومی یکسانیت کے ساتھ لسانی یکجہتی سے لبریز ذہانت پر ایک پختہ مہر ثبت ہوتی ہے۔ اسی ایک مثال سے ان کے تشخص پر فرقہ پرستی کے التزام کیے گئے غلط الزام کا بھی مناسب دفاع ہو جاتا ہے۔

تقریباً اسی عہد میں ہندی زبان کے کوی شری سُمِترانندن پنت کو قدرتی مناظر کا ایک جاندار و شاندار کوی تسلیم کیا جا رہا تھا، وہ الموڑا کے کوسانی موسومہ پہاڑی گاؤں سے آ کر الہ آباد میں مقیم تھے، انکے کاویہ میں دو سطور یہ تھیں:۔

کب سے وِلوکتی تم کو، اوُشا آ واتایَن سے
سندھیا اُداس پھر جاتی، سوُنے گرہ کے آنگن سے

کوی نے خدا سے ہی بلا واسطہ خطاب کرتے

ہوئے فرمایا ہے کہ

بعض اوقات صبح بھی آ کر تمہیں جھروکے سے دیکھا کرتی ہے
اور شام بھی تمہیں تلاش کرنے کی جستجو میں
گھر کے اُجاڑ برآمدے میں تمہیں نہ پا کر
وہاں سے بھی غمگین ہو کر
واپس ہو جایا کرتی ہے

دیگر الفاظ میں خود قدرت کے مختلف مناظر بھی خدا کے دیدار کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔

اب فیض احمد فیضؔ کے اس شعر پر غور و خوض کیجئے اور ہندی کوی پنت جی کے خیالات سے استفادہ کرنے کا ایک پُختہ ثبوت دیکھ کر حیران و ششدر ہونے کا ایک زریں موقعہ حاصل کریں۔ فیضؔ کے اول شعری مجموعے 'نقشِ فریادی' میں مشمول غزل کا مقطع ہے:

تم آئے ہو ، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے 2

کہنے کی ضرورت نہیں ہے، کہ یہاں بھی شاعر کا عشق مجازی نہ ہو کر صد فی صد حقیقی حیثیت کا ہی ہے۔ دورِ غلامی کے مابین شہادت پانے والوں کے تئیں احترام کے جذبے کی عکاسی لاتعداد شعرا نے کی ہے۔ ان میں فیض احمد فیضؔ کا نام سرِ فہرست رہا ہے۔ انکا ایک شعر ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

آگے موجودہ دور میں احمد فرازؔ تک پر اسی شعر کا اثر، بالخصوص **'دھج'** لفظ کا دانستاً تصرف یوں ملحوظِ خاطر ہے:

کوئے جاناں میں بھی خاصہ تھا طرح دار فرازؔ
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جدا

متوسطین کے دور میں کہیں کہیں اردو کی مانند دیگر زبان کے کسی شاعر یا کوی کی شعری سطور یا دوہوں وغیرہ کا بھی اثر دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ مثلاً ہندی کے مشہور کوی اور سنت کبیر نے اپنے ایک پدَ میں بھگوان کی جانب سے انسان کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ:

نہ میں چھری گڑاس میں، نہ میں کعبے کیلاس میں
موکو کیا ڈھونڈے بندے مَیں تو تیرے پاس میں 3

ان سطور سے متاثر جناب بی۔ ایس۔ جین جوہرؔ کا یہ ایک شعر ہے:۔

اپنے اندر کہیں چھپا تھا خدا
دیر میں ڈھونڈا، پر نہیں دیکھا 4

اسی طرح سے سنت اور مہا کوی کبیر کے خیالات کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ہی 'شری گورو گرنتھ صاحب' جیسے پنجابی زبان کے شہرۂ آفاق صحیفہ میں بھی ایک بھگت کے بطور انکی بانی کو شامل کیا گیا تھا۔ کبیر کا بہترین دوہا ہے:

ہم گھر جالیا اپنا لیا مُرا ڑا ہاتھ
اب گھر جالوں تاس کا، جے چلے ہمارے ساتھ 5

یعنی ہم نے اپنا 'گھر' جلا لیا ہے اور ہاتھ میں ایک مشعل اٹھالی ہے۔ اب میں کسی اور کا گھر جلاؤنگا، اگر وہ میرے ساتھ چلے۔

لاکھوں سنتوں فقیروں کی طویل تاریخ میں مہاتما کبیر اول فقیر تھے جنہوں نے 'گھر' لفظ کو انسان کی خودغرضی کی علامت یا مظہر اعلان کر کے اس کے خلاف احتجاج کا علم سب سے پہلے بلند کیا تھا۔ علامتی معنی کے بموجب انہوں نے اپنا خودغرضی والا 'گھر' جلا دیا ہے اور اب وہ اپنے جیسے دوسروں کی فلاح و بہبود کے متلاشی لوگوں کے بھی 'ایسے ہی علامتی 'گھر' جلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے از خود تسلیم کیا تھا کہ انہوں نے از خود 'مسی کاگد چھو یو نہیں، کلم گہی نہیں ہاتھ' یعنی وہ یکسر بے علم تھے بموجب ضرب المثل 'کالا اکشر بھینس برابر'' ان سے ایسے بلند و نایاب فکر کا حامل ہونا بجائے خود ایک کرشمہ ہی تھا۔

فلمی دنیا میں بھی رہ کر ادبی نغمات کی تخلیق کرنے والے مجروحؔ سلطانپوری تک نے کبیر کے متذکرہ بالا دوہے کے مفہوم کا اتباع کر کے یہ شعر کہا تھا:

جلا کے مشعلِ جاں، ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے، ہمارے ساتھ چلے 6

مجروحؔ کے دوسرے شعری مجموعے کا نام بھی 'مشعلِ جاں' رکھا جانا ان کا کبیر کے فلسفائے حیات سے ازحد متاثر ہونے پر ہی ایک انمٹ مہر نصب کرنا مانا جا سکتا ہے۔ ہمعصر دور کے ادبا کو بھی ان سے سبق لینا چاہئے۔

اسی طرح مہا کوی تلسی داس جی نے اپنے موسومہ شہرۂ آفاق صحیفہ 'شری رام چرت مانس' میں لکھا ہے کہ اس دنیا میں بالآخر ہوتا وہی ہے، جو کہ شری رام یعنی عام معنی میں بھگوان نے جو کچھ بھی کسی انسان کے لیے پہلے سے طے کر رکھا ہے، وہی اس کے ساتھ ہمیشہ واقع ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا بیکار میں اسے وسوسوں اور فکروں میں ہرگز ملوث نہیں رہنا چاہئے۔

ہوئی ہے سوئی، جو رام رچی راکھا،
و کری ترک ، بڑھوا وہی ساکھا 7

یعنی جو کچھ بھگوان (خدا) نے پہلے سے ہی انسان کے لیے طے کر رکھا ہے، بلآخر وہی ہوتا ہے، لہٰذا فضول کی دلیل بازی کرتے ہوئے اپنی عزت بڑھانے کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔

ضرب المثل بن چکے اردو شاعر برقؔ کا ایک ایسا شعر ہے، جسکے دوئیم مصرعے کے ہی بموجب ''ہوتا ہے وہی جو منظورِ خدا ہوتا ہے''۔ انکے مشہور شعر کے اول مصرعے کا متن دو طرح سے دستیاب ہوتا ہے۔

۱۔ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے 8
۲۔ اے صنم، وصل کی تدبیروں میں کیا رکھا ہے

اب جوہرؔ کا اسی مفہوم پر مبنی شعر یہ ہے۔ ''جو کچھ ہونا ہے، ہوتا ہے رقدرت کی پھٹکار کڑی ہے۔ 9

ہندی کی ادبی تاریخ میں (Experimentalism) کے بانی مشہور کوی **اگیے**

نے اپنی کسی نظم میں دورِ حاضر میں دنوں دن بتدریج افزوں ہوتے جا رہی ہے اجنبیت کے احساس کی بابت لکھا تھا:

بھیڑ میں بھی دِکھ جاتا ہے آدمی انگار سا اکیلا

دورِ حاضر میں سائنسی اور مادی ترقی کے ہی موجب لوگوں میں باہم ابعاد یا دوریاں آتی چلی جا رہی ہیں اور تمام دنیا کے بین الاقوامی گاؤں میں تبدیل ہونے کے باوصف آج کا آدمی دنوں دن تنہائی اور حد درجے کی ذاتی اجنبیت (Self Alienation) کے جذبے کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو تا حال کل آٹھ شعری مجموعوں کے خالق جناب **بی۔ایس۔جین جوہرؔ** کے سماجی سروکاروں کی نشان دہی کرتے رہنے والے قلم نے یوں رقم کیا ہے:۔

کتنے لوگوں سے شناسائی ہے
پھر بھی اس بھیڑ میں تنہائی ہے 10

اس تحقیقی مقالے کے تحت جوہرؔ صاحب کے فقط ایک مجموعے 'صوت وصدا' پر مبنی اشعار ہی دیے گئے ہیں۔ لہٰذا آخر میں 'حواشی' کی فہرست میں 'مجموعہ' نام سے اسی مجموعے کو منقوشِ خاطر کیا جائے۔ اسی طرح لاتعداد اشعار کی مثالیں درج کی جا سکتی ہیں۔

۲۔غالبؔ، میر تقی میرؔ اور ذوقؔ وغیرہ شعرا کے محرک اشعار:

اگرچہ متعدد قدیم شعرا کی کلاسیکی شاعری سے تو متوسطین اور ہم عصر شعرا کی جدید شاعری تک نے ہی موضوع و اسلوب دونوں کے ہی مدِ نظر بیشتر استفادہ کرتے ہوئے اپنے شعار کے مفاہیم و اسلوبی صفات کی دولت کو کاملاً متمول اور فعال کیا ہے، تاہم یہاں پہلے ان تین افضل و مقدم شعرا کے اشعار پر ہی ایک نظرِ ثانی کی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے شاعرِ اعظم غالبؔ کے ہی اشعار کا ذکرِ خیر کرتے ہیں۔ اکثر ہم عصر شعرا کسی محرک شعر میں سے ایک یا دو الفاظ لے کر اپنے شعر کی نوک پلک سنوارا کرتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کا ایک شعر تھا:۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزید ہم ہوں

یہاں غالبؔ نے 'کُتّے' کے ساتھ ایک انسان کی حیران کن تمثیل دیتے ہوئے دوسرے انسان سے ہی مارے جانے کے دردناک المیے کا بیان کیا تھا۔ گزشتہ صدی کے نامور شاعر جناب اختر الایمان نے بھی اسی شعر میں نہفتہ اہم مفہوم سے رغبت لے کر یہ ایک شعر قلم بند کیا تھا:۔

بشر گزیدہ ہوں میں، لے چلو یہاں سے مجھے
میرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی

یہاں شاعر نے غالبؔ کے الفاظ **'مردم گزید'** کو انہیں کے مترادف الفاظ **'بشر گزیدہ'** سے تبدیل کر دیا ہے۔ غالبؔ کے متعدد اشعار کے عکس جوہرؔ صاحب کے اشعار پر بھی نمایاں ہوتے رہے ہیں اور اسی لیے انہیں غالبؔ کا مرہونِ منت ہونا چاہیے۔ مثلاً موصوف نے اس مجموعے کے آغاز میں مرزا کے اس مشہور شعر کا حوالہ دیا ہے۔11

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے،
نے ہاتھ باگ پر ہے، نے پا ہے رِکاب میں 12

اب اسی ایک شعر میں مستعمل ایک لفظ 'نے' کا دانستاً تصرف کرتے ہوئے جناب جوہرؔ نے یہ دو خاص شعر کہے ہیں:۔

شعر وارد یوں ہی ہو جاتے ہیں الہام کی طرح
نے مرے ہاتھ میں رہتا ہے قلم اور نہ بیاض

جو بھی کہتا ہوں، وہ وجدان کی کیفیت ہے
نے کبھی مشقِ سخن اور نہ کرتا ہوں ریاض 13

غالبؔ کے جن دیگر اشعار کا عکس جوہرؔ کے اشعار پر دیکھا جا سکتا ہے ان میں اُنکا مقبولِ عام شعر یہ ہے۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے 14

اب جوہر کا شعر دیکھیے:

آدمی ہم بھی بڑے کام کے تھے
کیا سے کیا خود کو بنا لیا ہم نے 15

اسی طرح غالبؔ کا ہی مقبولِ عام شعر ہے:۔

بلبل کے کاروبار پہ خندہ ہائے دل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا 16

بقول جوہرؔ:

عشق تدبیر کا محتاج نہیں
اس مرض کا کوئی علاج نہیں 17

بھوپال کے رشید انجم صاحب اپنے ایک تحقیقی مقالے زیرِ عنوان **''بیگم اختر: کلاسیکی غزل کی آبرومند آواز''** میں کہتے ہیں کہ۔''جس طرح اپنے دور میں مشہور فلمی اداکارہ نمیؔ کی والدہ وحیدن بائی آگرے والی ایک مشہور طوائف تھی، ٹھیک اسی طرح نرگس کی والدہ جدّن بائی بھی 'کلکتے والی' کے نام سے کافی مقبول تھی۔ ان کا بھی خاندانی پیشہ مغنیہ بیگم اختر کی مانند رقص و نغمہ تک ہی محدود تھا۔ جدن بائی اس پائے کی مغنیہ تھیں کہ انہوں نے ہی کندن لال سہگل کو غالبؔ کی غزل 'نکتہ چیں ہے غمِ دل، اس کو سنائے نہ بنے' کا انداز سکھایا تھا اور یہ بھی ان کے ذہن نشین کیا تھا کہ غزل گائیکی میں تلفظ اور الفاظ کی صحیح اور بر وقت ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ جو لفظ گلوکار ادا کر رہا ہو، اس کے معنی سے بھی اس کا واقف ہونا لازمی ہے، تبھی آواز میں حسنِ لطافت پیدا ہوتا ہے۔18

غالبؔ کی مندرجہ بالا غزل کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے 19

اب غالبؔ اور داغؔ کے دو اشعار کی آمیزش سے جوہرؔ کے قلم سے ماخوذ شعر یہ ہے:

ہم نے سوچا تھا، لگا لائیں گے باتوں میں اسے

کیا بنے بات اگر بات بنائے نہ بنے20

دراصل اس شعر کا دوم مصرعہ مرزا غالبؔ کے مقبولِ عام شعر کے دوم مصرعے کا ہی متقاضی کہا جا سکتا ہے۔ ردیف بھی وہی ہے اور قافیہ بھی۔ مرزا داغؔ کا بھی ایک شعر یہ ہے:

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں21

اس شعر میں داغؔ اور غالبؔ کے اشعار کے اول مصرعوں کی مشابہت کو منقوشِ خاطر رکھیں۔ اسی طرح غالبؔ کا یہ نفسیاتی شعر از حد اعلیٰ اور ارفع مانا جاتا رہا ہے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے۔22

جہاں مرزا غالبؔ کا شعر فقط عشق کی وادی تک ہی محدود تھا، وہاں جوہرؔ نے اسی موضوع کو شہادت کے علاقے تک بھی مطلوبہ وسعت عطا کر دی ہے۔23 غالبؔ کی ایک دیگر غزل کے فلسفیانہ اشعار ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا24

اسی شعر کے موضوع و اسلوب دونوں کے ہی کے اثرات جوہرؔ کے ان اشعار پر جس طرح سے خودی کے جذبات نمایاں ہیں، وہ قابلِ غور و خوض ہے:

میں نہیں تھا تو کیا نہیں تھا یہاں، میں نہ ہوں گا تو کیا نہیں ہوگا
چلتا ہے کاروبارِ حیات، کام کوئی رکا نہیں ہوگا25

جہاں غالبؔ کے اشعار فلسفۂ حیات کی زرد رنگ افسردگی سے لبریز ہیں، وہاں اس کے عین برعکس جوہرؔ نے امید پرستی کے سبز رنگ جذبات سے انسانوں کی حرکات و سکنات کو حتی الامکان مہمیز کرنے کی سعی کی ہے، جو کہ اپنی اہمیت و افادیت رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان اشعار میں معنی آفرینی ہونے کے باوصف مرزا غالبؔ کے اشعار کا تقریباً تتبع کرنے والے تضمین کے اسلوب سے الگ جوہرؔ کے اشعار ملاحظہ کریں۔ جوشؔ ملسیانی نے غالبؔ کے اس شعر کو 'معاملہ بندی (تغزل) کے عنوان کے تحت رکھا تھا :۔''رنج کی گفتگو ہونے لگی/میں سے تم، تم سے تو ہونے لگی۔26

اب جوہرؔ کا یہ شعر فقط ایک ہی لفظ ('رنج' کی جگہ 'بےتکلف') کی تبدیلی سے یوں ظہور پذیر ہے:

بے تکلف گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی27

اسی طرح غالبؔ کا ایک شعر ہے:

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی28

اب جوہرؔ کا یہ شعر دیکھئے:

موت کو ایک دن تو آنا ہے
ذہن میں رات دن تناؤ ہے کیوں

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ:

اصل میں جوہرؔ بہادر شاہ ظفرؔ کے اس شعر میں منعکس اس عندیہ یا نصب العین کے حامل گردانے جا سکتے ہیں، جو انہوں نے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ جیسے بلند پایہ علامہ شاعر کو اپنا استاد بنانے پر بھی، بغیر انکا نام لیے، یوں ظاہر کیا تھا۔

اے ظفرؔ اپنی ریاضت کا نہ جب تک بل ہو
نہ تو بل پیر کا کام آئے، نہ استاد کا بل29

بی۔ ایس۔ جین جوہرؔ بھی حتی الامکان خودی اور انانیت پرست ایک خود دار شخص اور شاعر رہے ہیں۔ ان کے اس شعر سے مفہوم کی مناسبت کے نظریے سے موازنہ کیجیے:۔

اربابِ سیاست کی ہم نے نہ خوشامد کی
اور سادھوؤں، سنتوں کے بھی پاؤں نہ سہلائے30

اسی قبیل کا چند ایک اشعار لائقِ غور و خوض یہ ہیں:۔

گنگناتے ہوئے ہوجاتے ہیں موزوں الفاظ
جن سے ہوتا ہے مرے شعر و سخن کا آغاز31

میں نے اربابِ حکومت کے قصیدے نہ لکھے
میری نظروں میں ہیں سب ایک سے محمود و ایاز32

نامساعد حالات میں بھی یہ شاعر سماج اور معاشرے میں مساوات و مارکسی نظریات کا صد فیصد پیروکار رہے، اسے کسی بھی سیاسی، مذہبی یا ادبی تحریک سے وابستہ براہِ راست باندھا نہیں جا سکتا ہے۔ ذوقؔ کا ایک خاص شعر ہے:۔

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے33

اب اسی شعر میں سے چند الفاظ لے کر قدیم ہندی فلموں کے نغمہ نگار و شاعر **سرشار سیلانی** نے ایک ایسے امر شعر کی تخلیق کی تھی، جو کہ ذوقؔ کے مندرجہ بالا شعر سے کئی گنا زیادہ مقبول اور زبان زد ہو کر ایک ضرب المثل کی صورت اختیار کر کے عام گفتگو میں بھی مروجہ ہو چکا ہے۔ جب میں چند برس قبل اپنے ہندی ناول 'ہرا درپن' کا قومی انعام حاصل کرنے کے لیے دہلی گیا تھا، اس وقت نیشنل میوزیم میں منعقد تقریب میں تب کے مرکزی وزیر اعلیٰ جناب لالتا پرشاد شاہی نے **سرشار سیلانی** کا یہ شعر اسٹیج پر اپنے صدارتی خطبے میں سنایا تھا:۔

چمن میں اختلافِ رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہمیں ہم ہیں تو کیا ہم ہیں، تمہیں تم ہو تو کیا تم ہو

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس شعر میں بلا کی روانی اور غضب کی غنایت ہی اس کی عوامی بے پناہ مقبولیت و ضرب المثل کی ہی مانند زبان زدگی کی باعث رہی ہے۔ اصل میں جوہرؔ بہادر شاہ ظفر کے اگلے درج شعر میں منعکس اس عندیہ یا نصب العین کے حامل گردانے جا سکتے ہیں، جو انہوں نے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ جیسے بلند پایہ علامہ شاعر کو اپنا استاد بنانے پر بھی، بغیر انکا نام لیے، یوں ظاہر کیا تھا:۔

اے ظفرؔ اپنی ریاضت کا نہ جب تک بل ہو
نہ تو بل پیر کا کام آئے، نہ استاد کا بل

اب پنجابی زبان کی نظموں میں چند سطور کے ساتھ توارد یا مشابہت کی ایک بے نظیر مثال ملاحظہ فرمائیں۔ پنجابی زبان میں دورِ جدید کے اولیں کویوں میں بطور ایک عہد ساز ادیب کے بھائی ویر سنگھ جی کا نام ایک روحانی سربستگی پسند کوی کے بطور خاصہ مشہور رہا ہے۔ رب کو مخاطب انکی ایک نظم کی سطور ہیں۔

سپنے وچ تُساں ملے اساں نوں، اساں دھا گل وکڑی پائی
نرا نُور تُساں ہتھ نا آئے، ساڈی کنبدی رہی کلائی

یعنی ''اے رب! آپ مجھے میرے خواب میں جب ملے، تب ہم نے دوڑ کر تمہارے ساتھ بغلگیری کر لی تھی۔ لیکن (یہ کیا!) تم تو فقط تجلی بھر تھے۔ لہٰذا تم میرے ہاتھ نہ آئے اور ہماری کلائی تولرزتی ہی رہ گئی تھی۔''

فکر کی وسعت کا دائرہ اتنا ہمہ گیر ہوا کرتا ہے کہ کوئی دو اشخاص از حد درمیانی ابعاد یعنی فاصلوں کے با وصف اور ایک دوسرے کو ملے بغیر ایک جیسے مشابہہ خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں کوئل (سنسکرت و ہندی زبانوں میں لفظ 'کوکل' مذکر اسم ہے، جس سے ہندی کا 'کوئل' لفظ بنتا ہے اور اسکی مادہ کے لیے سنسکرت میں 'کوکلا' اور ہندی میں 'کوئلہ' نہ کہہ کر 'مادہ کوئل' لفظ اسی لیے مستعمل ہوتا ہے، کیونکہ دنیا میں 'کوئلہ' ایک دوسری شئے ہوتی ہے) 'کوئل' پرندہ (گاتی نہیں) گاتا ہے اور اسکا رنگ بھی کالا سیاہ ہوتا ہے، اسی کے متوازن انگریزی زبان میں اسی کا مترادف لفظ ہے ککّو Cuckoo۔ بطور مماثلت و موازنہ یہ ایک دیگر مثال ضرور ہے۔

اب دورِ جدید کے سربراہ پنجابی کوی بھائی ویر سنگھ جی کی سطور کا جناب ذوقؔ کے اس آزاد و تصوف آمیز شعر کے مفہوم سے موازنہ نہ کریں، کیونکہ ایک مضمون کے بموجب شاعر جناب محمد حسین آزادؔ نے ایک مضمون کے بموجب یہ اعلان کیا تھا کہ ذوقؔ کو تصوف میں 'ایک عالمِ خاص' تھا۔34

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بوئے گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا 35

داغ دہلوی کا یہ شعر:

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں 36

جوہر کا یہ شعر جس کا تذکرہ ہو چکا ہے:

ہم نے سوچا تھا لگا لائیں گے باتوں میں اسے
کیا بنے بات اگر بات بنائے نہ بنے 37

اکبرؔ الہ آبادی

اکبرؔ الہ آبادی کا ایک مزاحیہ شعر پیش ہے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جا کر 38

جوہرؔ کے ان اشعار پر بھی اس شعر کا اثر ممکن ہو سکتا ہے:

نہ گھر میں رہنے کو جی چاہتا ہے
سفر میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔39
عمر گزری کرائے پر رہتے
اپنا رہنے کا ٹھکانہ نہ ہوا۔40

امیرؔ مینائی

فارسی زبان میں ایک ضرب المثل مشہور ہے 'زندگی آدم مانند حباب است۔' یعنی انسان کی زندگی پانی کے ایک بلبلے کی ہی طرح سے ناپائیدار ہوا کرتی ہے۔ متوسطین شعرا میں امیرؔ مینائی کا ایک بلند مقام مانا جاتا رہا ہے۔ انکا یہ شعر ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکا ہے:

زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ
آدمی بلبلہ ہے پانی کا 41

مولوی عبد الرشید رضاؔ تھانیسری متوسطین شاعر محمد رفیع سوداؔ کے ایک ہمعصری شاعر تھے اور قدرے کم مقبول ہی رہے تھے۔ انکا بھی ایک شعر امیرؔ مینائی کے متذکرہ بالا شعر کا ہی اتباع معلوم ہوتا ہے۔ ان کا شعر تھا:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

پتہ نہیں جوہرؔ نے ان میں سے ضرب المثل بن چکے کس شعر کی بنیاد پر یہ شعر کہا ہے:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
بلبلہ ہے یہ ایک پانی کا 42

سنت کبیر کا یہ شعر:

نہ میں چھری گڑا اس میں، نہ میں کعبے کیلاس میں
موکو کیا ڈھونڈے بندے میں تو تیرے پاس میں 43

بزمِ اکبرآبادی

ان کے ایک شعر کا اصل متن یہ رہا ہے:

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامِ چند
گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا

ان ہی کا مزید یہ شعر بھی بدلی ہوئی اس صورت میں عوام الناس میں عام طور پر مرو جہ رہا ہے

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا 44

بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بطور ریڈر رفائز جناب حنیف نقوی نے اپنی ایک کتاب میں اس شعر کی بابت یہ کہا ہے کہ کسی باذوق شخص نے بنا کسی ارادے کے اس شعر کو غالبؔ کے شعری مزاج سے، ہم آہنگ کر کے اس شعر کے خالق کو مقبولیت دینی چاہی ہے۔45

چونکہ اس شعرِ خاص کا مواد و اسلوب جناب اکبرؔ الہ آبادی کے مواد و اسلوب سے کافی مشابہہ رکھتا ہے، اسی لیے اسے انکے نام کے ساتھ غلطی سے منسوب کیا جاتا رہا ہے لہٰذا جب تک بزمؔ اکبرآبادی کے اصل کی ہی صورت تسلیم کر لیا جائے اور دوسری بار دیے گئے حوالے کے متن کو اسی شعر کی بدلی ہوئی صورت کا درجہ عطا کیا جائے۔

ان مذکور بالا سطور سے متاثر جوہرؔ کا یہ ایک شعر ضرور جاذب نظر ہوا ہے: ''اپنے اندر کہیں چھپا تھا خدا، دیر میں ڈھونڈا، پر نہیں دیکھا۔46

دشینت کمار

بشیر بدر نے جدید دور میں غزل کے بدلے ہوئے موضوعی تیوروں کو یہ کہہ کر نشان زد کیا تھا:

غزلیں پہلے شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

ہندی میں بطور صنفِ ادب بالخصوص شاعری میں غزل کے پیروکار اور ایک بانی کی ہی حیثیت رکھنے والے غزل گو شاعر دشینت کمار تھے جو اس شعر سے ہندی شاعری میں مشہور و مقبولِ عام ہوئے تھے:

کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لیے
کہاں چراغ میسر نہیں شہر کے لیے 7 4

انہیں کا ایک اور شعر ہے:

میں جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں
وہ غزل آپ کو سناتا ہوں

اب عمیق و دقیق مطالعے کے لیے جناب جوہر کا بھی ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

اس عمر کو پہنچ کر پانا ہے کچھ نہ کھونا
اب شاعری ہی میرا ہے اوڑھنا بچھونا 8 4

دیگر شعرا کے اثرات

ہمعصری اردو شاعری کے ساتھ تو جوہر صاحب تقریباً قدم تال ملا کر چلتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں انکا مطالعہ بھی عمیق و دقیق رہا ہے اور اسی کے اثرات بھی انکی شاعری میں جا بجا نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ آگے چند مثالیں درج کی جا رہی ہیں:۔

جوہر صاحب کے ذہن پر اقبال کی شاعری کا بھی اثر نمایاں رہا ہے۔ انکا بطور توثیق یہ شعر پیش ہے:

گنے جاتے نہیں سیاست میں
جھونپڑوں میں ملیں گے لاکھوں سر 9 4

متقدمین اردو شعرا کے بعد دورِ حاضر کے شعرا کے عمیق و دقیق مطالعے کے ثبوت گاہے بگاہے جوہر کی شاعری کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ یہاں ان کی ہی شاعری سے چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں، جو کہ قابلِ غور و خوض گردانی جانی چاہئے:

فراق گورکھپوری

علامہ اقبال کے بعد فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے معاصر فراق گورکھپوری کا لائق تعظیم و تکریم مقام رہا ہے۔ ان کا ایک مشہور زبان زد شعر ہے:

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں 0 5

قتیل شفائی

حسن و عشق کے اعلیٰ و ارفع جذبات سے لبریز انکی رومانی شاعری نے نہ صرف ادبی حلقوں میں، بلکہ فلمی دنیا میں بھی تہلکہ مچایا تھا۔ انکا یہ قطعہ بہت مقبول رہا تھا:

مانوس کس قدر ہوں میں اس رنگ روپ سے
گو اس سے پیشتر تجھے دیکھا کبھی نہیں
تو اجنبی ہے پھر بھی میرے دل کی دھڑکنیں
کہتی ہیں بار بار کہ تو اجنبی نہیں 1 5

اب جوہر کے اس شعر پر نظر ثانی کیجئے:

ایسی خوش فہمی سے ہم کو ہر کوئی اپنا لگا
راہ میں جو بھی ملا، پہلے کہیں دیکھا لگا۔ 2 5

قتیل شفائی کا ہی یہ شعر تھا:

جب بھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں 53

31 اگست سنہ 2016 کو فوت ہوئے مشہور ادیب و شاعر جناب کشمیری لال ذاکر نے ڈاکٹر رینو بہل کو بذاتِ خود ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ انکے بہت قریبی مراسم قتیل شفائی صاحب سے تھے اور متذکرہ بالا شعر انہوں نے لوگوں کے حسد کو دیکھ کر ہی اپنے اور انکے بارے میں کہا تھا۔ ان ہی کے الفاظ تھے:

''یہ شعر اس نے میرے لیے لکھا تھا۔ زیادہ تر وقت ہم دونوں کا ایک ساتھ گزرتا۔ لوگ ہماری دوستی سے جلتے تھے۔ ملک تقسیم ہو گیا، میں یہاں اور وہ وہاں رہ گیا۔ مگر ہماری دوستی میں دور رہ کر بھی کوئی فرق نہیں آیا، تا عمر ہماری دوستی برقرار رہی۔''54

بشیر بدر

ان کی شاعری کے دیوانوں اور پرستاروں کی بھی مطلق کمی نہیں رہی ہے۔ ان کا خود داری اور خود مختاری سے لبریز یہ شعر دیکھیں:

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا 5 5

ادھر جوہر کا بھی بطور شاعر یہ عندیہ کتنا مشابہت رکھتا ہے:

راہ میں کتنے سنگِ میل آئے
ایک ہی راہ پہ میں چلتا رہا 6 5

بشیر بدر کی غزل کا ایک شعر ہے:

اس کی آنکھوں کا ساون برسنے لگا
بادلوں میں پرندہ گھرا دیکھ کر

اب جوہر کی قلم کا جوہر ملاحظہ کریں:

جانے کیا رشتہ ہے مانس کا ساون سے
اڈیں گر جذبات تو بادل گھر گھر آئے 7 5

اسی طرح شعرا بے عنان ہو کر جس تس شاعر کے کسی بھی شعر سے معدودے چند الفاظ مستعار لے کر ایک نے شعر کی تشکیل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ انکا یہ عمل کتنا واجب یا غیر واجب ہے، یہ ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے۔

ندا فاضلی

قتیل شفائی کی ہی مانند یہ بھی ادبی اور فلمی دنیا میں اپنی معیاری شاعری کی بدولت بتدریج ترقی اور مقبولیت کے زینوں پر گامزن ہوتے چلے گئے تھے۔ انکی یہ سطور ٹی۔ وی۔ کی مختلف تقریبات اور مقابلاتی کارکردگیوں میں کسی ضرب المثل کی ہی مانند زندگی میں ماں کی اہمیت کی خط کشی کرنے کے لیے انو کپور جیسے اداکاروں و اینکروں نے بارہا سنائی ہیں:

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی، بن چٹھی بن تار

جوہر کے قلم نے حبِ وطن کے ساتھ ساتھ اپنی

حیات میں تا عمر ایک انسان کے لیے اسکی ماں کی بے انتہا شفقت کا چشمہ رواں دواں رہنے کی حقیقت کی ان الفاظ نشان دہی کی ہے:۔''یہ کیا پتا تھا وطن کو چھوڑا تو لوٹ کر آئیں گے نہ واپس، سفر میں ہجرت کے آنسوؤں سے میں پاؤں ماں کے بھگو گیا ہوں۔58

منور رانا

یہ اصلاً اسٹیجوں کے شاعر ہیں اور انکی سات آٹھ کتب شعری مجموعوں کی صورت میں شائع ہو کر عوام الناس میں مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں میں اپنے ہم عصر شاعر راجیش ریڈی کی مانند ہی بلند پایہ شاعر گردانے جاتے ہیں۔ ان کا یہ ایک شعر دیہاتوں کی بنسبت شہری تہذیب وتمدن میں انسانیت کے فقدان کی ترجمانی کرنے کے موجب بارہا حوالوں میں آتا رہتا ہے۔ یہ اس طرح ہے:

تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپر بھی سب مل کر اٹھاتے ہیں

جوہر کا نگینے سا یہ شعر کتنا پیارا ہے:

جنازے میں امیرِ شہر کے کندھے بدلتے ہیں
کسی مفلس کی میت کو تو کندھا بھی نہیں ملتا 59

محمود رامپوری

بطور ایک شاعر انکی عظمت کی بنیاد یہ شاندار شعر مانا جاتا رہا ہے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

اس شعر کا تاریخی پس منظر بتاتے ہوئے الہ آباد کے عالم و فاضل نقاد جناب فضل حسنین نے 'آجکل' جریدہ کے مئی سنہ 2015 کے تازہ شمارے میں اپنے زیرِ عنوان مضمون ''بڑے آدمی کی بڑی بات'' میں بتایا ہے کہ۔''داغ کے ایک دوسرے شاگرد جلیل مانک پوری نے رام پور میں قیام کے دوران اپنے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد کیا، جس میں مصرع طرح دیا؛ **''عید کا دن ہے میری جان سنورنے کے لیے۔''** جب محمود رامپوری نے یہ (متذکرہ بالا) شعر پڑھا، تو سامعین پر بیخودی کا عالم طاری ہو گیا اور داغ کے بھائی شاغل نے اپنی غزل پڑھنے سے انکار کر دیا۔ محمود رامپوری کا نام زندہ رکھنے کے لیے صرف یہی ایک شعر کافی ہے۔60

جوہر نے اسی مضمون کو اپنے رنگ میں تشکیل دیتے ہوئے اس میں اپنی انفرادیت اس نوعیت سے قائم کی ہے:

ہم نے مانا کہ لوگ جائیں گے
لوٹ کر پھر کبھی نہ آئیں گے
یگ پرش جو گیا ہے دنیا سے
اس کا ثانی ہوا، نہیں ہوگا 61

ایک اور نصیحت آموز وعبرت ناک شعر پیشِ خدمت ہے

آنے والی نسلیں جس سے تم پہ ہمیشہ ناز کریں
دنیا میں جب آ ہی گئے ہو، کوئی تو ایسا کام کرو62

مظفر رزمی:

کہتے ہیں جب چند برس قبل پاکستان کے اس وقت کے صدر جناب پرویز مشرف صاحب ہندوستان تشریف لائے تھے، تب انہوں نے یہاں کے شاعر مظفر رزمی کا یہ مشہور شعر پرائم منسٹر منموہن سنگھ جی کو سنایا تھا اور انکی صلاح پر اس وقت منموہن سنگھ جی نے دہلی کے سرکاری ادارے 'اردو اکادمی' سے اس شاعر کا پتا کروا کر اسے اپنے دولت خانے پر بلوا کر اس سے بصد احترام اس شاعر کی پوری غزل سنی تھی۔ یہ حقیقت اردو کے مجلہ 'بیباک' میں دو سال قبل شائع ایک مضمون میں بتائی گی تھی۔ وہ مقبولِ عام اور شاعر کی شاعرانہ عظمت کا نمائندہ بن چکا شعر یہ تھا:

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی

چند نقاد اس شعر میں ہمارے موقر سیاسی رہنماؤں کی خطا کو ہی ہندوستان پاکستان کے بٹوارے اور بعد ازاں واقع ہونے والے المیوں کی پیشگی ترجمانی اعلان کرتے رہے ہیں۔ جوہر صاحب نے اسی کے زیرِ اثر اپنا یہ شعر یوں تشکیل کیا ہے

بھول اپنی وہ بھی ایک لمحے کی
باعثِ زوال و نام و ننگ ہے 63

شکیل اعظمی

ہمعصر اردو شاعری میں ان کا ایک بلند مقام رہا ہے۔ دوردرشن کی ایک تقریب میں مزاحیہ ایکٹر جانی لیور سے سنے ہوئے شکیل صاحب کے یہ دو اشعار دوسرے مقبولِ عام ایکٹر انّو کپور نے سنائے تھے۔ مغرب سے آکر ہندوستان وغیرہ ممالک کی فضا کو تہس نہس کرنے اور بتدریج بازار و تہذیب و تمدن کی وبا پھیلانے اور دنوں دن مہمیز کرنے پر طنز کرنے کے نظریے سے کہے گئے تھے:

ہر گھڑی چشمِ خریدار میں رہنے کے لیے
یہ ہنر چاہئے بازار میں رہنے کے لیے
اب تو بدنامی سے شہرت کا وہ رشتہ ہے کہ لوگ
ننگے ہو جاتے ہیں اخبار میں رہنے کے لیے

شکیل صاحب کے اشعار اس فوٹو سے مطلق نسبت نہ رکھتے ہونگے اور ایک دم الگ سے کہے گئے ہونگے۔ لیکن اخباروں کی سرخیوں میں بنے رہنے کی زبردست خواہش کو لوگوں، بالخصوص، اس ملک کے رہنماؤں کے ضمن میں صحیح طریقے سے نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ یہی بات جوہر کے ان اشعار پر بھی صادق آتی ہے:

سیاست میں بھی گمنامی کے ڈر سے
خبر میں رہنے کو جی چاہتا ہے 64
اخبار کی سرخی میں جو رہتے ہیں ہمیشہ
رکھتے ہیں پریشان انہیں ملک کے حالات

عمر شفق

ان کا یہ شعر اس زندگی کو جہنم ماننے کے باوصف اس کو خیر باد کہہ کر جانے کے لیے مطلق تیار نہ ہونے والوں پر ایک گہرا طنز کرتا ہے:

دنیا تو جہنم ہے مگر چھوڑ کے اس کو
جانے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے5 6

اب جوہرؔ کا یہ شعر قابلِ موازنہ ہے:

دنیا میں سب اکتائے ہوئے ہیں، اس بات سے تو انکار نہیں
جنت کی دعائیں مانگتے ہیں، جانے کو کوئی تیار نہیں

(دوسرے مجموعے سے ماخوذ)

تلسی داس

مہا کوی تُلسی داس جی کے 'شری رام چرت مانس' موسومہ شہرۂ آفاق صحیفہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اس دنیا میں بلآخر ہوتا وہی ہے، جو کہ شری رام یعنی عام مفہوم میں بھگوان نے جو کچھ بھی کسی انسان کے لیے طے کر رکھا ہے، وہی اس کے ساتھ ہمیشہ واقع ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا بیکار میں اسے وسوسوں اور فکروں میں ملوث ہرگز نہیں رہنا چاہیئے۔ 'ہوئی ہے سوئی، جو رام رچی راکھا، کو کری ترک، بڑھاوہی ساکھا۔66

کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہوگا وہی جو رام (خدا یا رَب) نے ہمارے لیے پہلے سے ہی طے کر رکھا ہے۔ لہٰذا فضول ہی بحث مباحثے میں کبھی نہیں پڑنا چاہئے۔ اب اسی مفہوم کا جوہرؔ کا یہ شعر قابلِ موازنہ ہے:

جو کچھ ہونا ہے، ہوتا ہے
قدرت کی پھٹکار کڑی ہے 7 6

اگیے

انہوں نے کہیں لکھا تھا کہ ''بھیڑ میں بھی دِکھ جاتا ہے آدمی انگار سا اکیلا'' دورِ حاضر میں سائنسی اور مادی ترقی کے ہی موجب لوگوں میں باہم دوریاں آتی چلی جا رہی ہیں اور وہ دنوں دن تنہائی اور حد درجے کی اجنبیت کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو جوہرؔ کے سماجی سروکاروں کی نشاندہی کرتے رہنے والے قلم نے اس پیرائے میں رقم کیا ہے:۔

کتنے لوگوں سے شناسائی ہے
پھر بھی اس بھیڑ میں تنہائی ہے8 6

ہندی نغمات کے اثرات

علامہ اقبال کا ایک مصرعہ تھا:

تُو ہی مِری آرزو، تو ہی مِری جاں

محمد خالد عابدی صاحب نے اپنی کتاب 'ہماری فلمیں اور اردو' میں مشمول مضمون 'علامہ اقبال کا کلام فلموں میں' کے تحت یہ درج کیا ہے۔ ''رویندر ناتھ ٹیگور کی کہانی پر بمل رائے کی فلم 'کابلی والا'' (سنہ 1961، اداکار بلراج ساہنی اور اوشا کرن) میں پریم دھون کے لکھے گیت کے بول تھے:

اے میرے پیارے وطن
اے میرے بچھڑے چمن
تُجھ پہ دل قرباں
تو ہی میری آرزو، تو ہی میری جاں!

منجملہ الفاظ میں آخری بولوں کا محرک اقبالؔ کا مندرجہ بالا مصرعہ ہی تھا اور اس گیت کو منّا ڈے نے گایا تھا۔

سنہ 1955 میں 'آبِ حیات' نام سے ایک فلم آئی تھی، اس میں قمر جلال آبادی کا تخلیق شدہ ایک گیت تھا۔

تو نے پلائے نظروں کے جام سے ہم بھی گئے کام سے

آشا بھونسلے کے گائے اس گیت میں اقبالؔ کے اس شعر کا استعمال ہوا تھا:۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی9 6

اسی طرح اقبال کی ہی نظم 'ترانۂ ہندی' کا ہی ایک مصرعہ تھا:۔ ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا...'' نغمہ نگار ساحرؔ لدھیانوی نے فلم 'پھر صبح ہوگی' میں ایک سطر جمع کر کے ایک پیروڈی ہی بنا ڈالی تھی:

چین و عرب ہمارا، رہنے کو گھر نہیں، سارا جہاں ہمارا

سنہ 1951 میں 'بھائی بہن' نام سے ایک فلم آئی تھی، جس میں اقبالؔ کا 'ترانۂ ہندی' مشہور گیت شامل تھا۔ اسی میں یہ سطور تھیں:

'پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا'
'گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں'

راجہ مہدی علی خاں نے اقبالؔ کے اول الذکر دونوں مصرعوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنا یہ مصرعہ بنالیا تھا:

پربت ہیں اسکے اونچے، پیاری ہیں اسکی ندیاں

اس طرح یہ پتا چلتا ہے کہ کس طرح سے نغمہ نگار پیروڈیاں بھی بناتے رہے ہیں۔

سنہ 1966 میں 'دُلہن ایک رات کی' نام کی ایک فلم آئی تھی، اس کی کہانی ٹامس ہارڈی کے انگریزی کے شہرۂ آفاق ناول 'دی ٹیس' پر مبنی تھی۔ فلم میں اقبالؔ کی اس مطلع والی غزل کے چار اشعار لیے گئے تھے اور انہیں ملکۂ ترنم لتا منگیشکر اور انکی ہمنوا نے گایا تھا:۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں جلوے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

سنہ 1936 میں فلم 'کروڑ پتی' میں نغمہ نگار کیدار شرما نے اقبالؔ کے متذکرہ بالا غزل کے اول مصرعے کو مسخ کر کے لکھا تھا:

کبھی اے حقیقتِ رس بھری، نظر آ لباسِ شراب میں

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے70

سنہ 1972 میں بی۔ آر، چوپڑا کی 'داستان' فلم ظہور پذیر ہوئی تھی، اس میں محمد رفیع کے گایا ہوا ایک گیت پسِ منظر میں تھا جس کے بولوں میں اول مصرعہ تو اقبالؔ کا ہی تھا، لیکن دوم مصرعہ ساحرؔ لدھیانوی نے اپنی جانب سے یہ رکھ دیا تھا:۔

ترا وُجود ہے اب صرف داستاں کے لیے

ایک پرانی ہندی فلم 'دو بدن' کے ایک نغمے میں سمی گریوال پر فلمائے گئے ایک نغمے کے بول یہ تھے:

'مجھے خوشی ملی اتنی کہ من میں نہ سمائے
پلک بند کر لوں کہیں چھلک ہی نہ جائے

اب جوہرؔ کے قلم سے اخذ اس ایک شعر پر غور کریں:

دیکھ لر انکو خوشی اب ملی ہے
وہ خوشی جو نہ دل میں سمائے

ایک غیر فلمی نغمات کی البلیم اور دیو آنند کی کو لیکشن (Collection) میں کشور کمار کے گائے نغمے کے بھی یہ بول دستیاب ہوئے ہیں:

دکھی من میرے سن میرا کہنا
جہاں نہیں چینا، وہاں نہیں رہنا

اسی طرح ہندی فلم ''امر پریم'' میں ایکٹر راجیش کھنہ پر فلمائے ہوئے ایک نغمے کے بھی بول تھے:

کچھ تو لوگ کہیں گے
لوگوں کا کام ہے کہنا
چھوڑو بیکار کی باتوں میں
کہیں بیت نہ جائے رینا
کچھ تو لوگ کہیں گے 1 7

جناب جوہرؔ کا شعر قابلِ غور ہے:

خلاقی اور صناعی کا کرب تو خود ہی سہیں گے
لوگوں کا تو کام ہے کہنا، کچھ تو لوگ کہیں گے 72

احمد فرازؔ کی ایک مقبولِ عام غزل کے مقطع کا شعر تھا:

کب کے بچھڑے ہوئے ہم آج کہاں آ کے ملے
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اسی کے اول مصرعہ ''کب کے بچھڑے ہوئے ہم آج کہاں آ کے ملے...'' کو مِن وعن لے کر ہندی فلم 'لاوارث' میں امی تابھ بچن اور زینت امان پر شاندار نغمہ انجان نغمہ نگار نے بنایا تھا۔ نغمے کے گلوکار تھے کشور کمار و آشا بھونسلے۔ موسیقی کے ہدایت کار تھے کلیان جی آنند جی 73 اسی طرح ایک قدیم دور کے شاعر شیخ طراب علی قلندرؔ کا کوروی کا شعر تھا:

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو 74

اسی کے الفاظ پر مبنی ہندی فلم 'لیلیٰ مجنوں' کے ایک اہم نغمے (جو کہ اداکار رشی کپور اور اداکارہ رنجیتا پر فلمایا گیا تھا) کا مکھڑا اس صورت میں تشکیل کیا گیا تھا:

حسن حاضر ہے، محبت کی سزا پانے کو
کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو

قدیم زمانے کیا یک ہندی فلم 'دشمن' میں نغمہ نگار شری کشور کمار کے گائے ہوئے ایک نغمے کا مکھڑا تھا۔

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔

یہ مکھڑا بھی جناب مستؔ کلکتوی کے ہی اس شعر کا مِن وعن اتباع ہے۔ ان کے متعدد اشعار عام عوام کے بیچ زبان زد ہو چکے ہیں اور روزمرہ کا ہی ایک حصہ بن چکے ہیں۔ لوگ تو انکے خالقوں کے نام تک فراموش کر چکے ہیں۔ بالخصوص انکے اس شعر میں تو دنیا سے استعارہ لے کر حقیقت سے عملی مفاد کی جاندار و شاندار عکاسی کی گئی ہے۔ جوانوں اور بزرگوں میں یہ شعر خاصہ مقبول رہا ہے۔

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے 75

اس شعر میں فقط مستعمل اول لفظ 'حقیقت' کی جگہ پر 'موسیقیت وغنائیت' کے زیرِ تقاضا 'سچائی' لفظ اس استعمال کیا گیا تھا۔ اسی طرح اشعار کی باہمی فکری مشابہت و تواُرد کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آیا ہے۔

اس موضوع پر بہت مضامین اس لیے منظرِ عام پر ظہور پذیر نہیں ہو سکے ہیں، کیونکہ اس کے لیے فی الاصل کئی برسوں کے مطالعے کی درکار ہوا کرتی ہے۔ یہ اس ناچیز کی ایک ذاتی رائے ہے۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت

سنسکرت زبان میں زندگی میں ہر ایک بات میں زیادتی سے اپنا بچاؤ کرنے کی صالح صلاح یا مشورہ دیتے ہوئے خاص طور پر کہا گیا ہے کہ 'اتی سروتر ورجیت'، یعنی حد سے زیادہ مقدار کو کسی بھی بات یا معاملے میں استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ انگریزی زبان میں یہ کہاوت باہم رابطے یا میل جول کو ایک مخصوص حد میں رکھنے کی ہی تلقین کرتی ہے:

Too much familiarity breeds contempt

قدیم ہندی فلم 'پرتی شرُتی' کا تو موضوع ہی یہی سبق فراہم کرنا مقصود تھا۔ اب جوہرؔ کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

یہ ترکِ تعلق کے آثار ہیں کیا
نہ تم آتے جاتے نہ ہم کو بلاتے 6 7

جناب جوہرؔ نے اسی نصیحت کا کئی بار اعادہ کیا ہے۔ مثلاً یہ فرماتے ہیں:

ایک ہی گھر میں ساتھ رہنے سے
پیار بڑھتا ہے اور عداوت بھی
اس سے بہتر ہے آج کے یُگ میں
فاصلہ بھی ہو اور قربت بھی 7 7

اسی مفید تجویز کو سید رحمانی صاحب نے بھی اس شعر کے توسط سے ظاہر کیا ہے:

آپ نے کمی کی ہے ملنے اور ملانے میں
سچ ہے پیار گھٹتا ہے روز آنے جانے میں۔ 78

اسی نوعیت کے ہزار ہا اشعار کا خزینہ دستیاب ہونا ممکن ہے کیونکہ بقول سنت کبیر

جِن کھوجا، تِن پایا گہرے پانی پیٹھ
میں باپُری ڈوُبن ڈری رہی کنارے بیٹھ

زندگی کی صعوبتیں اور شعراء

چونکہ زندگی قدیم زمانوں سے آج کے دور تک آتے آتے مشکل سے مشکل ترین ہوتی چلی گئی ہے، اسی لیے شعرا کے قلم نے اس کی عکاسی سب سے زیادہ کی ہے۔ مثلاً بیخودؔ دہلوی کا یہ شعر خوب پسند کیا جاتا رہا ہے:

کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آ گیا

اسی طرح **عرفان صدیقی** کا شعر ہے:

عشق میں کہتے ہیں کہ فرہاد نے کاٹا تھا پہاڑ
ہم نے دن کاٹ دیئے، یہ بھی ہنر ہے سائیں

اختر الایمان

(ویسے ایک عالم و فاضل ادیب نے کسی جریدے میں دو سال قبل اس اعتراض کا واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ ان بلند پایہ ادیب و شاعر کے نام کی ساخت اس صورت میں نہیں ہوسکتی ہے۔ان کا قلم بلا واسطہ خدا پر ہی طنزیہ انداز سے یوں رقم طراز ہوتا ہے:

تیرا کمال یہ ہے تو زمیں پہ لایا مجھے
مِرا کمال یہ ہے آج تک بھی زندہ ہوں

اعتبار ساجد کا بھی خدا کے تئیں یہ طنزیہ شعر دیکھیں:

دھوپ کے دشت میں شیشے کی ردائیں دی ہیں
زندگی، تو نے ہمیں کیسی سزائیں دی ہیں

اسی طرح لاتعداد اشعار اردو شاعری کے بطن سے نکل کر ہمارے ذہن و دل کو ایک نایاب اور لاجواب سا سکون بخشتے رہے ہیں، مفت میں ہی صحت افزا نفسیاتی خوراک دیتے رہے ہیں۔

تشخص کی انفرادیت

عموماً شعرا نے ایک احساسِ برتری (sense of superiority) کے ہی موجب اپنے تشخص کو دیگر اشخاص سے طرفہ گونا گون ثابت کرنے میں ہی تشفی حاصل کی ہے، جو کہ نفسیاتی سطح پر ایک صحیح قدم کہا جاسکتا ہے۔جاوید اختر کا یہ شعر اس پیرائے میں نمائندہ ہے:

جدھر جاتے ہیں سب، جانا ادھر اچھا نہیں لگتا
مجھے پامال راستوں کا سفر اچھا نہیں لگتا

ندا فاضلی کے اس شعر کو بھی قابلِ موازنہ گردانا جاسکتا ہے:

میں اپنی ہی الجھی ہوئی راہوں کا تماشہ
جاتے ہیں جدھر سب، میں ادھر کیوں نہیں جاتا

حب الوطنی کا جذبہ

اس قومی محبت کے جذبے نے لاتعداد شعرا کو شاعری کی سطح پر متحرک کر کے انکے قلم سے لاجواب و نایاب اشعار کی تخلیق کروائی ہے۔شاعری کی مثالیں اس سے قبل دی جا چکی ہیں۔اب فلمی نغموں کے توسط سے ادبیت کے بھی نایاب نمونے پیش کرنے والے شعرا پردیپ، کیفی اعظمی اور گلزار وغیرہ کے ناموں کا شمار کیا جاسکتا ہے۔کہتے ہیں نغمہ نگار جناب پردیپ نے سنہ 1962 میں چین کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے ہندوستانی نوجوانوں کی یاد میں بقائے دوام کی حیثیت اختیار کر لینے والا ایک نغمہ لکھا تھا۔ملکۂ ترنم لتا منگیشکر کے دہلی میں گائے ہوئے اسی نغمے کے ان بولوں کو سن کر پنڈت جواہر لال نہرو کی آنکھیں بھر آئی تھیں:

اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھر لو پانی
جو شہید ہوئے ہیں انکی ذرا یاد کرو قربانی

محترمہ کانتی ایّر نے اسی ماہ شائع ہوئی اپنی تازہ ترین کتاب 'وِرل ویکیتو' میں مشمول اپنے مضمون 'کوی پردیپ' میں لکھا ہے کہ اس گیت کی رائیلٹی بھی شہید کی وِدھواؤں (بیواؤں) کو دے دی تھی۔79

کیفی اعظمی کی نظم کے بھی یہ الفاظ شہرۂ آفاق پذیرائی کے مستحق ہو چکے ہیں:۔

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن، ساتھیو!
(ہندی فلم 'حقیقت')

بھلا گلزار کہاں پیچھے رہنے والے تھے:

اے میرے پیارے وطن
اے میرے بچھڑے چمن
تجھ پہ دل قرباں!
تو ہی میری آرزو
تو ہی میری آبرو
تو ہی میری جاں!

موت کی المناک حقیقت

زندگی کے اس اذیت ناک المیے کی بابت تقریباً ہر ایک ادیب یا شاعر نے اپنے احساسات کو ہویدا کیا ہے۔ہندوؤں کے صحیفہ 'مہابھارت' میں یکش نے یُدھشٹر متعدد سوالات میں سے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ زندگی کی کون سی حقیقت سب سے زیادہ حیرت آمیز ہوتی ہے اور پانڈو یُدھشٹر نے جواباً موت کا ہی نام لیا تھا۔اردو میں تا حال لاکھوں اشعار اسی وفات کے ضمن میں کہے جا چکے ہیں۔ شعرا ایک دوسرے شاعر کے جذبے سے باہم استفادہ کرتے چلے رہے ہیں۔مثلاً معدودے چند اشعار رقم کر کے ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔امید ہے قارئین از خود موازنہ یا تقابلہ کر کے موانست اور مماثلت پا کر محظوظ و سیراب بھی ہوتے رہ سکتے ہیں۔

ذوق کا شعر دیکھیں:

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

یہاں 'جدائی' موت کی ہی مظہر ہے۔

انہیں کا یہ شعر بہت مقبول ہوا ہے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے 0 8

ہمعصر دور کے استاد شاعر شاد عظیم آبادی کے اس شعر سے لفظیات کا تقابل کیجئے:

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

مرزا داغ کی شاعری کا بہت اثر بعد میں آنے والے مقلد شعرا پر دیدنی رہا ہے۔انہیں کا ایک شعر تھا:

خبر سُن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

جب مسلم لیگ جیسی شہرۂ آفاق مذہبی تنظیم کے موجد و بانی سَر سید احمد خاں جنت نشین ہوئے، تب اکبر الہ آبادی نے یہ شعر کہا تھا:۔

یہ دنیا ہے کہ جو چاہے کہے اکبر یہ کہتا ہے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
فانی بدایونی کا یہ لافانی حیثیت کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

انشاء کے قلم سے یہ شعر اخذ ہوا تھا:۔

بہت سے آچکے ہیں، جو نہیں آئے، وہ آتے جاتے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نواب مرزا شوق لکھنوی کا مشہور و معروف شعر ہے:

موت سے کس کو راستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

جناب بی۔ایس۔جین جوہر صاحب نے موت کی حقیقت سے روشناس کراتے ہوئے بھی حیات کے متواتر جاری ساری رہنے کی بابت انسان کو روشناس کرایا ہے اور امید پرست رہ کر اپنے کام کاج کرتے رہنے کی تلقین یوں کی ہے:

دنیا سے کوئی جائے تو رکتے ہیں کہیں کام
کیا مرغ نہیں ہو تو سویرا نہیں ہوتا

اس طرح مختلف شعرا کی شاعری میں پنہاں متعدد پہلو تلاش کیے جا سکتے ہیں، فقط ایک ایماندار و متلاشی جویا محقق کی ہی درکار ہوا کرتی ہے۔ جو بات کسی ایک شاعر پر صادق آتی ہے، تقریباً وہی کم و بیش دیگر متعدد شعرا پر بھی اسی کو محمول کیا جا سکتا ہے، فرق فقط مشابہہ اشعار کی مقدار و شمار کا ہو سکتا ہے۔ یہ مضمون اسی حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے نصب العین سے تیار کیا گیا ہے اور کسی بھی معزز شاعر کی بے حرمتی کرنے کی غلطی کرنے کے بغیر یہ ناچیز اردو شاعری میں مروجہ فقط ایک عام ہیئت یا اسلوبِ خاص کی ہی خط کشی کرتا ہے اور مستزاد، اسی نظریے سے ایک مفصل کتاب تیار کرنے کی از حد و فوری ضرورت کو نشان زد کرنے کے عندیے کو قارئین، اساتذہ و محققان کے رو برو رکھنے کے لیے تحقیق کے تقریباً ایک نئے موضوع کی پیشکش یا تجویز کرتا ہے۔ پنجابی زبان کے عالم و فاضل ادیب، ناقد و شاعر جناب پروفیسر موہن سنگھ جی کا ایک نصیحت آمیز مقولہ محولہ کرنے کے لالچ کا دفاع کرنا اس خاکسار کے تئیں فی الحال ممکن نہیں ہو پا رہا ہے۔

لائی لگ مومن دے نالوں، کھوجی کافر چنگا

یعنی کسی خدا پرست پیرو یا مقلد ہونے کے بجائے ایک جویا کا فرشخص کہیں بہتر ہوا کرتا ہے۔

حواشی:

1. کلیاتِ اقبال، صفحہ 295
2. ہندی کتاب 'فیض'، مرتبہ شمشیر بہادر سنگھ اور مُغیص الدین فریدی، ناشر: راج کمل پرکاشن، نئی دہلی، تیسری اشاعت سنہ 2010، صفحہ 21
3. مرتب: کرشن بھاؤک، مجموعہ، تنقید و تشریح 'کبیر گرنتھاولی کا ارتھ وِوِیچن'' پیپسو بک ڈپو، پٹیالہ۔سنت کبیر کا پد۔
4. بی۔ایس۔جین جوہر، مجموعہ 'صوت وصدا'، ص 72
5. مرتب: کرشن بھاؤک، مجموعہ، تنقید و تشریح 'کبیر گرنتھاولی کا ارتھ وِوِیچن''۔پیپسو بک ڈپو، پٹیالہ۔سنت کبیر کا دوہا۔
6. خلیق انجم، مرتبہ کتاب ''گُل کاریٔ وحشت کا شاعر مجروح''، محولہ، ص 60
7. گوسوامی تلسی داس، 'شری رام چرت مانس'، 1/52/4، ''تلسی شبد ساگر''، مرتب ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، اول ایڈیشن، لفظ 'ساکھ'، ص 452 شری رام چرت مانس' گیتا پریس کورکھپور، نیا ایڈیشن۔
8. غزلیاتِ برق، صفحہ 82
9. جوہر، مجموعہ 'صوت وصدا'، ص 156
10. ایضاً، ص 334
11. ایضاً، مضمون، 'بی۔ایس۔جین جوہر، مضمون 'صوت وصدا کا باوقار شاعر بی۔ایس۔جین جوہر''، ص 40۔
12. 1. وشوناتھ (راجپال اینڈ سنز کے مالک) مرتبہ 'دیوانِ غالب' ص 87 2. جوش ملسیانی، شرحِ دیوانِ غالب، بک کار پو ریشن، دہلی، سنہِ اشاعت 2011 ص 195
13. ایضاً، مجموعہ 'صوت وصدا'، ص 78
14. ایضاً، ہندی 'دیوانِ غالب'، مرتبہ: وشوناتھ، وشووجے، پرائیویٹ لمیٹڈ۔نئی دہلی، ص 160
15. جوہر، مجموعہ ایضاً، ص 154
16. دیوانِ غالب، ص 123
17. جوہر، مجموعہ ایضاً، ص 46
18. مؤلف ڈاکٹر الف انصاری، ضخیم کتاب ''ہندوستانی فلم کا آغاز وارتقا'' جلد دوم، رشید انجم، مضمون ''بیگم اختر: کلاسیکی غزل کی آبرو مند آواز''، ص 182-83
19. 1. ایضاً، وشوناتھ، دیوانِ غالب، ص 164
    2. 'شرحِ دیوانِ غالب' مرتب، جوش ملسیانی، 315
20. جوہر، مجموعہ، ایضاً، ص 100
21. ہندی مجموعہ ''داغ کی شاعری'، مرتب ساجن پیشاوری، منوج پبلیکیشنز، دہلی، ایڈیشن، سنہ 2005, ص 139.
22. وشوناتھ، مرتب 'دیوانِ غالب'، ص 158
    2. شرحِ دیوانِ غالب' جوش ملسیانی، ص 303
23. جوہر، مجموعہ، ایضاً، ص 132
24. 1. وشوناتھ، ہندی 'دیوانِ غالب'، ص 38
    2. جوش ملسیانی، شرحِ دیوانِ غالب'، ص 97
    3. دیوانِ غالب، ص 122
25. جوہر، مجموعہ، ایضاً، ص 126
26. شرحِ دیوانِ غالب، ایضاً، ص 29.
27. مجموعہ، ایضاً، ص 136

28. دیوانِ غالبؔ، ص409

29. جوہرؔ، مجموعہ ایضاً، ص174.

30. مجموعہ ایضاً ص212.

31. مجموعہ ایضاً، ص 78

32. مجموعہ ایضاً، ص 80.

33. کتاب 'شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مرتبہ: اسلم پرویز، انجمن ترقی (اردو ہند)، نئی دہلی، سنہ اشاعت 1999، ص187,318

34. ہندی مجموعہ ''داغ کی شاعری'، مرتب ساجن پیشاوری، منوج پبلیکیشنز، دہلی، ایڈیشن سنہ 2 005، ص139

35. جوہرؔ، ایضاً، مجموعہ 'صوت وصدا'، ص100

36. ہندی مجموعہ 'اکبرالہ آبادی'، مرتب شمیم حنفی، وانی پرکاشن، دوسرا ایڈیشن سنہ 2005، ص25

37. جوہرؔ، ایضاً، مجموعہ، ص138

38. ایضاً، مجموعہ، ص214

39. 'غیرتِ بہارستاں'، ص 1432. 2 بحولہ۔ مرتب خلیق الزماں نصرت، ''برمحل اشعار اور انکے ماخذ'، ص89

40. جوہرؔ، ایضاً، مجموعہ، ص100

41. مضمون '''شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوان ذوقؔ''، جریدہ 'ہندوستانی'، اکتوبر 1944

42. شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مرتبہ اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو (ہند)، سنہ اشاعت 1999، ص188

43. خلیق الزماں نصرت، بحولہ شعر سنہ طباعت دوم 2011، ص 317

44. دشینت کمار، ہندی غزلیات کا مجموعہ 'سایے میں دھوپ'، ص10

45. جوہرؔ، مجموعہ 'ایضاً'، ص264

46. مجموعہ ایضاً ص64

47. مرتب: کرشن بھاؤک، مجموعہ، تنقید وتشریح 'کبیر گرنتھاولی کا ارتھ وِیچن''پیپسو بک ڈپو، پٹیالہ۔ سنت کبیر کا پد۔

48. ''غالبؔ: احوال و آثار''، نصرت پبلی شرز، سنہ 1990

49. جوہرؔ، مجموعہ 'ایضاً'، ص72

50. فراق گورکھپوری، مجموعہ 'گلِ نغمہ'، ص 45

51. جوہرؔ مجموعہ ایضاً، ص82

52. 1. کلیاتِ قتیلؔ، ص 223. 'گلستانِ ہزار رنگ'، ص 230, برمحل اشعار اور انکے ماخذ'، ص 180

53. ڈاکٹر رینو بہل مضمون 'کرم یوگی کشمیری لال ذاکرؔ'، جریدہ 'لفظ لفظ'، ۷۵ واں شمارہ، ص24

54. جوہرؔ مجموعہ ایضاً، ص100

55. بشیر بدر، ہندی مجموعہ 'اللہ حافظ'، وانی پرکاشن، نئی دھلی، دوسرا ایڈیشن سنہ 2005 ص79

56. جوہرؔ، مجموعہ، ایضاً، ص104

57. مجموعہ 'ایضاً، ص322

58. مجموعہ 'ایضاً، ص82

59. مجموعہ 'ایضاً، ص116

60. آجکل، مئی سنہ 2015، فضل حسنین، مضمون 'بڑے آدمی کی بڑی بات'، ص30

61. مجموعہ 'ایضاً'، ص 126

62. مجموعہ ایضاً، ص 324

63. جوہرؔ مجموعہ ایضاً، ص140

64. جوہرؔ مجموعہ ایضاً، ص138

65. جوہر مجموعہ، ایضاً، ص332

66. تُلسی داس، 'شری رام چرت مانس'، 1-5-24 'تلسی شبد ساگر'، مرتب ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، اول اشاعت، لفظ 'ساکھا'، ص452

67. مجموعہ ایضاً ص156

68. مجموعہ ایضاً ص334

69. محمد خالد عبادی، کتاب 'ہماری فلمیں اور اردو'، مکتبہ عابدیہ، بھوپال، مضمون 'علامہ اقبالؔ کا کلام فلموں میں'، ص89-93.

70. جوہرؔ مجموعہ ایضاً ص76

71. مرتبہ رانی شری واستو، ہندی گیتوں کا مجموعہ 'کشور کے ہٹ فلمی گیت''، منوج پبلیکیشنز، دہلی۔ چوتھا ایڈیشن سنہ 2011 ص58

72. محمد خالد عبادی، مرتبہ کتاب 'ہماری فلمیں اور اردو'، مضمون ''اقبالؔ کا کلام فلموں میں'، ص 89-93.

73. مجموعہ ایضاً ص96

74. خلیق الزماں نصرت، ہندی مجموعہ 'مشہور اشعار: گمنام شاعر'، ہندی ترجمہ پروفیسر صدرِ عالم گوہرؔ، کائنات پبلیکیشن، بھونڈی۔ 4 2 1 3 0 2 (مہاراشٹر) ص4

75. کرشن بھاؤک، مضمون ''اشعار اور مصرعے جو گئے بدل، بنے ضرب المثل''۔ کتابی سلسلہ 11-12 اپریل تا ستمبر 2014 شمارہ 7-8، ص187-197

76. مجموعہ ایضاً، ص284

77. مجموعہ ایضاً، ص 388

78. سید رحمانی، ماہنامہ جریدہ 'ادیب'، اپریل سنہ 2014 ص66

79. کانتی ایّر، مضامین کا مجموعہ 'وِرل ویکتِتو' اول اشاعت سنہ 2018 صفحہ 63

80. کتاب 'شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مرتبہ: اسلم پرویز، انجمن ترقی (اردو ہند)، نئی دہلی، سنہ اشاعت 1999، ص318,268,182

❑❑❑

ورثہ

زنیرہ

ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد
روم نمبر ۱۰۴، ایل ایچ ۷، ساؤتھ
کیمپس، گچی باؤلی،
حیدرآباد (تلنگانہ)
رابطہ: 9493011532

گھر میں بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی کیونکہ آج بڑے ابا کی تیسویں برسی تھی.....منجھلی بوا اور چھوٹی چچی آنگن کو رگڑ رگڑ کر دھل رہی تھیں۔لڑکیاں ان کی مدد کر رہی تھیں.....کوئی پانی ڈال رہا تھا تو کوئی پاؤڈر چھڑک رہا تھا.....میں نے جیسے ہی آگے قدم بڑھانا چاہا ماہم زور سے چلائی.....''ارشد بھائی! پلیز جوتا اتار کر آئیں نہیں تو گندگی بھی اس کے ساتھ آجائے گی اور ہماری ساری محنت غارت ہوجائے گی۔''میں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر لال لال، سرخ اینٹوں کو جو دھلنے سے نکھر آئیں تھیں۔میں جوتا اتار کر ابا کے کمرے میں چلا گیا۔وہاں بڑی رونق تھی چھوٹے چچا، منجھلے چچا اور صائمہ بوا سر جوڑے کسی خاص موضوع پر گفت وشنید تھے۔میں واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ ابا کی نظر مجھ پر پڑ گئی.....''آیئے۔۔آیئے برخوردار! بات دراصل یہ ہے کہ آج شام میں بڑے ابا کا کمرہ کھولا جائے گا اور اس کی صفائی کے بعد تم کو ہی اس میں رہنا ہے''۔یہ سن کر میں خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ بڑے ابا کے انتقال کے بعد ان کے کمرے میں تالا ڈال دیا گیا تھا اور اس کو کھولنے کی اجازت کسی کو نہیں تھی یہ اور بات ہے کہ سخت ممانعت کے باوجود بھی ہم لوگ بچپن میں کئی بار تالا توڑنے کی کوشش کر چکے تھے اور ناکام رہے تھے۔اس لیے اب تک بڑے ابا کا کمرہ ہم سب کے لیے ایک ''مسٹری'' بنا ہوا تھا۔لڑکیاں تو ادھر جانے کے نام سے ہی ڈرتی تھیں کیونکہ اماں اور چچی نے انھیں ادھر جانے سے روک رکھا تھا یہ کہہ کر کہ ادھر آسیب ہے اور ہمیں اپنی زندگی برباد نہیں کرنی ہے لیکن لڑکوں کے لیے بڑے ابا کا کمرہ کسی ہالی ووڈ کی فلم سے کم دلچسپ نہ تھا.....میں یہ خوشخبری سنانے کے لیے اظہر کے کمرے کی طرف بھاگا۔

شام کو ہم سب بڑے ابا کے کمرے کے پاس جمع تھے.....راشد ایک لوہے کی راڈ سے دروازے پر لگے تالے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا.....بڑی محنت کے بعد آخر کار تالا ٹوٹ گیا.....ابا نے دروازہ کھولا.....کمرہ جالوں اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔صفائی کا کام لڑکوں کے ذمے کیا گیا اور اس کے لیے ہم سب پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔یہ کمرہ گھر کے دیگر کمروں کے مقابلے میں بڑا تھا.....بٹھیک درمیان میں ایک پلنگ تھی.....اس کے ایک سائڈ میں ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر ایک مٹی کی صراحی اور ایک گلاس رکھا تھا.....اور دوسری سائڈ میں ایک بڑی میز اور کرسی تھی۔میز پر ایک نوٹ بک اور چند اسلامی و تاریخی کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ بڑے ابا لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ ابا سے سنتے آئیں تھے کہ بڑے ابا کافی نفاست پسند تھے اور یہی وجہ تھی کہ کمرے میں ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی..... دیواروں میں جگہ جگہ طاق بنے ہوئے تھے اور ان کے درمیان زرا اوپر کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں جو سائز میں کافی بڑی تھیں..... ایک طرف لکڑی کی چھوٹی سی الماری تھی میں نے اسے کھولا اندر کچھ کرتا پاجامہ، صدری اور ایک لمبی سی ٹوپی رکھی ہوئی تھی جس پر زری سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نظر میں ان سب کا جائزہ لے لیا تھا۔ یہ بڑے ابا کے کپڑے ہیں میں نے ان پر ہاتھ پھیرا اور ان پر جمی گرد کو جھاڑا..... کونے میں ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا تھا اس کو کھولنے کے بعد ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے..... وہ کچھ عجیب وغریب سامان تھے... اسلم نے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا..... ''یہ کیا ہے؟'' سب نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پر جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اس کے علاوہ مٹی کے کئی برتن پلیٹ، پیالیاں اور ایک اور عجیب وغریب چیز..... یہ مٹی ہی کا کوئی صراحی نما برتن تھا جس کے اوپر ایک چھوٹی سی پلیٹ رکھی ہوئی تھی اور نیچے لوٹے کی ٹونٹی جیسا کچھ تھا ہم سب دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ''یہ حقہ ہے'' پیچھے سے ابا کی آواز سنائی دی وہ کب آئے ہمیں اس کا پتا ہی نہ چلا۔ ''حقہ.....؟'' ہم سب ایک ساتھ بولے..... ''ہاں پہلے لوگ اسی میں تمبا کو پھونکا کرتے تھے۔'' ''اور یہ.....؟'' اظہر نے جلدی سے وہ لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا..... ''یہ..... کھڑاؤں ہے پہلے لوگ اسے ہی چپل کی طرح پہنا کرتے تھے۔'' ''لیکن بڑے ابا اسے پہن کر چلتے کیسے تھے.....؟'' راشد نے استعجاب سے پوچھا تبھی اظہر صندوق میں سے کچھ اور اٹھا کر لایا ''اور یہ.....؟'' ابا اسے ہاتھ میں لے کر بولے ''یہ ہمارا خاندانی پاندان ہے..... یہ چاندی کا ہے'' پاندان.....؟ ہاں..... پہلے ایک خاندانی پاندان ہوا کرتا تھا جو مہمان کے آنے پر ایک گھر سے دوسرے گھر جایا کرتا تھا اور لوگ خود سے پان لگا کر کھاتے تھے۔ میں نے اسے کھولا اندر کئی خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں چھوٹی چھوٹی کٹوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ پاندان کے اوپر بیل بوٹے کی نقاشی تھی اور ان میں جگہ جگہ نگینے بھی جڑے ہوئے تھے..... اب ہم سب کی دلچسپی کا مرکز یہ پاندان بنا ہوا تھا۔

رات کو ایک بار پھر سب اکٹھا ہوئے تقریباً سبھی کا یہی خیال تھا کہ وہ سب سامان بے کار ہیں انھیں نکال دیا جائے..... ابا ان سامانوں کو دیکھ رہے تھے..... عورتوں میں خاص طور سے یہ چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں کہ سب بیکار ہیں ان کو رکھنے پر اور بھی صفائی کرنی پڑے گی یہ کوٹھی کیا کم ہے جس کی صفائی ہی سے ہم تھک جاتے ہیں۔ نوجوان نسل بھی یہی چاہتی تھی۔ ابا خاموش کھڑے کچھ سوچ رہے تھے..... میں نے ایک نظر ان کو دیکھا پھر بولا کہ ''نہیں..... کوئی چیز کباڑ میں نہیں جائے گی۔'' سب حیرت سے مجھے دیکھنے لگے..... اماں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا جس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں بولا ''اس کمرے میں مجھے رہنا ہے تو میں یہی چاہتا ہوں کہ اس میں موجود ساری چیزیں یوں ہی رہیں'' مخالفت بہت ہوئی لیکن میں بضد رہا۔ آخر کار میری ضد کے آگے سب نے ہار مان لی۔ میرے اس فیصلے سے ابا کے علاوہ کوئی خوش نہیں تھا۔

اگلے دن ابا کمرے میں آئے اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے ''ارشد! ایسا لگ رہا ہے کہ میرے ابا ابھی ابھی کمرے سے نکل کر گئے ہیں..... مجھے ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے سنو تم بھی..... کھٹ..... کھٹ..... سن رہے ہو نا؟'' اور میں ان کی آنکھوں میں ماضی کی زندہ تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ رات کو میں پلنگ پر لیٹا ہوا چھت پر بنے ہوئے نقش ونگار کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بیل بوٹوں کی نقاشی بہت خوبصورت لگ رہی تھی..... پھر میں اٹھ کر چہل قدمی کرنے لگا اور الماری کے پاس جا کر رک گیا..... دل میں ایک عجیب خیال آیا کہ کیوں نہ بڑے ابا کے کپڑے پہن کر دیکھوں..... وہ کافی ڈھیلے ہو رہے تھے کیونکہ بڑے ابا کسرتی بدن کے مالک تھے..... ابا اکثر ان کی پہلوانی کے قصے سنایا کرتے تھے۔ میں نے ٹوپی بھی سر پہ رکھ لی۔ آئینے میں دیکھا میری شخصیت بالکل ہی بدل گئی تھی..... پھر میں نے کھڑاؤں نکال کر اسے بھی پاؤں میں ڈالا اور بمشکل چند قدم ہی چل پایا۔ یہ سب کرتے ہوئے مجھے ایک انجانی سی خوشی ہو رہی تھی۔ میں پاندان کو ہاتھ میں لے کر پلنگ پر لیٹ گیا اور اسے دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں دھندسی چھانے لگی اور یکا یک منظر بدل گیا۔

گھوڑے پر سوار سفید جامے میں ایک نورانی چہرے والے بزرگ میرے پاس آکر رکے اور مسکرا کر بولے۔ ''ارشد! میں تم سے بہت خوش ہوں۔'' میں نے حیرت سے ان کو دیکھا..... ''آپ کون ہیں.....؟'' اور مجھ کو کیسے جانتے ہیں.....؟'' ''بیٹا! یہ میں ہوں..... تمہارے بڑے ابا'' ''بڑے ابا'' میں نے دہرایا..... ''ہاں بیٹا..... میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے وہ کیا ہے جو تیرے ابا بھی نہ کر سکے۔ تم نے ایک صدی کو زندہ کیا ہے..... وہ سب جو ہمارے پرکھوں کا ورثہ تھا تم نے اس ورثہ کو سنبھال کے رکھا۔''

اچانک گھوڑا حرکت میں آیا اور پھر دوڑنے لگا.....

''بڑے ابا!... بڑے ابا! میں نے انھیں روکنا چاہا... بڑے ابا!

میں چلا کر اٹھا..... اور میری آنکھ کھل گئی..... میں بڑے ابا کے کپڑے پہنے ہی سو گیا تھا کروٹ لی تو بازو میں پاندان تھا۔

□□□

کھنڈر سے آتی آوازیں

حنیف خان

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
رابطہ: 7355492869

کھنڈرات سے آتی ہوئی دلدوز آواز نے میری نیند بکھیر کر رکھ دی۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا مگر آواز ایسی تھی کہ کانوں سے چپک کر رہ گئی۔ پہلے تو بستر پر ہی پڑا رہا اور پھر ہاتھ سے چہرہ مل کر نیند دور کرنیکی ناکام کوشش کی، ہاں اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی تک جانے کے قابل ہو گیا۔ رات ٹھٹھری ہوئی تھی اس لئے جوں ہی کھڑکی کھولی ایسا لگا کہ یخ بستہ ہواؤں نے میری ہڈیوں کو برما دیا ہے، اس کے باوجود میں نے کھڑکی کھول کر سر باہر نکالا اور آواز کی سمت جاننے کی کوشش کی۔ یہ ایک نسوانی آواز تھی جس میں بین کا درد تھا، کبھی قدرے بلند ہو جاتی اور کبھی آہستہ۔ میں جس طرف کان لگاتا، یہ آواز اسی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوتی، جس کی وجہ سے آواز میرے لئے معمہ بن گئی۔ کافی دیر تک کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا بالآخر میں نے کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھڑکی بند کر دی۔ میں کوئی کمزور دل کا انسان نہیں ہوں، مجھ میں جرات ہے اور اسی وجہ سے میں نے اس فلیٹ کو کرائے پر لیا جسے کوئی لینا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ جس جگہ پر یہ فلیٹ ہے وہ بستی کا آخری کنارہ ہے۔ میرے فلیٹ کے بعد جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ فلیٹ بھی جنگل کاٹ کر تعمیر کیا گیا تھا۔ آخری مکان ہونے کی وجہ سے کوئی اسے لے نہیں رہا تھا مگر میں نے لے لیا۔

آواز کی سوزش اور اس کی دردناکی نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ رات کے سہ پہر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور پھر آواز کسی ایک جانب سے کیوں نہیں آ رہی ہے جس طرف کان لگاؤ، محسوس ہوتا ہے ادھر سے ہی آ رہی ہے، جس سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ مگر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ شاید یہ میرا وہم ہے اور ہوا کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ ہوا کا بہاؤ جس طرف س زیادہ ہوتا ہوگا آواز ادھر سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اسی ہوا کے دباؤ سے ہی آواز کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی مدھم، اس لئے زیادہ سوچنے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ تو طے تھا کہ آواز کھنڈرات سے ہی آ رہی ہے وہ بھی نسوانی آواز۔ جیسے ہی یہ بات ذہن میں آئی ایک بار پھر طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا اور نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔ میں سونے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا مگر کامیابی نہیں مل رہی تھی پھر ایک دم سے لگا کہ کوئی میرے بہت قریب رو رہا ہے بلکہ میرے دروازے کے پاس، میں تیزی سے اٹھا اور دروازے کی

طرف لپکا لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے شعور نے مجھے روک دیا اور اب میں بستر اور دروازے سے تقریباً برابر کی دوری پر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔ آواز مسلسل آرہی تھی، میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی، ذہن کام نہیں کر رہا تھا اور دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر ایک دم سے آواز بند ہوگئی۔ میں نے کان لگا کر اسے سننے کی کوشش کی مگر نہیں سن سکا تو یقین ہوگیا کہ اب آواز نہیں آرہی ہے۔

میں کمبل ڈالے بستر پر بیٹھا ہوا تھا مگر اب ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ دروازہ کھولوں حالانکہ اندر سے بیچین بھی تھا کہ باہر جھانک کر دیکھوں، بڑی محنت سے ہمت مجتمع کی اور اٹھ کر دروازے تک گیا، چٹخنی پر ہاتھ رکھا اور اسے دبانے ہی والا تھا کہ ہاتھ خود بخود رک گئے۔ اب ایک بار پھر پس وپیش میں پڑ گیا۔ اسی درمیان دور سے آذان کی آواز آتی ہوئی سنائی دی جس سے ہمت بندھی اور میں نے ایک جھٹکے میں دروازہ کھول دیا۔ سر باہر نکال کر ادھر ادھر جھانکا، کہیں کچھ نہیں تھا، اس لئے دوبارہ آکر بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند نہیں آرہی تھی پھر اچانک کب نیند آگئی اور میں محو خواب ہوگیا کچھ نہیں پتہ۔ میری آنکھ تقریباً 11 بجے کھلی اور گھڑی دیکھ کر گھبرا گیا کیونکہ آج میں آفس نہیں جا سکا تھا اور اب اتنی تاخیر ہو چکی تھی کہ جانا مناسب نہیں تھا۔

پورا دن یوں ہی گذر گیا، بستی میں کوئی ایسا بھی نہ تھا کہ جس سے میں اس بابت کوئی گفتگو کر سکتا اس لئے سب کچھ میرے اندر ہی چلتا رہا۔ البتہ شام ہوتے ہوتے میں نیاس کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ٹہلنے اور رات کا کھانا کھانے باہر نکل گیا کیونکہ میں تنہا رہتا تھا اور میرا اپنا گھر شہر سے کافی دور تھا۔ رات میں ذرا تاخیر سے میں واپس آیا لیکن واپسی میں بہت تھک چکا تھا اس لئے ٹی وی بھی نہیں آن کیا اور نہ ہی لیپ ٹاپ کھولا، کپڑے تبدیل کئے اور سیدھے بستر پر دراز ہوگیا۔

آنکھ کا کھلنا تھا کہ میرا ذہن آج کے بجائے پہلے کل رات کے واقعے کی طرف چلا گیا۔ اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایک طرف آج کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی اور دوسری طرف میرا ذہن کل کی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا، اس لئے جس طرح نیند کی حالت میں اس مترنم آواز سے محظوظ ہو رہا تھا اب نہیں ہو رہا تھا ہاں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سے پہلے اس سے میں محظوظ ہو رہا تھا۔ آواز کیا تھی، جادو۔ جو انسان کے پورے وجود کو اپنے طلسم میں لے لے، آواز کی دوشیزگی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ آواز کسی پکی عمر کی عورت کی نہیں ہے۔ اس کی کھنک اور سریلا پن خود میں محویت لئے ہوئے تھی۔ اس لئے کل رات کی باتیں بہت جلد ذہن سے کافور ہوگئیں اور میں اس کے سحر میں کھو گیا۔

ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آواز کو کن لفظیات کا پیرہن ملا ہوا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ آواز دور سے آرہی تھی اس لئے کیا لفظیات تھیں ان کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا البتہ اس کی لہک ایسی تھی کہ کوئی بھی شخص سب کچھ چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

میں نے بستر سے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ آج کوئی ڈر بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں ہمہ تن گوش آواز کی طرف متوجہ ہوگیا جس کی ہر لہک اور چہک میری رگ رگ میں اترتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں آج میں نے باہر جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ شاید لاشعور میں خوف رہا ہو لیکن یہ سچ ہے کہ آج میں بے خوف تھا۔ کافی دیر تک ہوا کے دوش پر اس نادیدہ دوشیزہ کی آواز اپنے سحر میں مجھے لئے رہی اور پھر دھیرے دھیرے آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔ جب آواز آنا بند ہو گئی تو میں بستر سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہوگیا اور اس کو سننے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید کسی طرف سے آرہی ہو مگر ایسا نہیں تھا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

آواز کا جادو مجھ پر ایسا ہوا کہ میں بستر پر آکر لیٹ گیا اور اس سے محظوظ ہونے لگا، جتنا میں اس آواز کے بارے میں سوچتا اتنا ہی مجھے وہ قریب محسوس ہوتی۔ میں سوچ رہا تھا خدایا یہ کیا مسئلہ ہے، کل ایسی دلدوز آواز تھی کہ جگر پھٹ جائے اور آج ایسی آواز کی دل وجان لٹ جائے۔ میں کل اور آج رات کی دونوں آوازوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے یہاں شفٹ ہوئے دس دن سے زیادہ نہیں ہوئے تھے، اس سے قبل کبھی کوئی آواز سنی نہیں تھی لیکن آج یہ مسلسل دوسرا دن تھا۔ میرا ذہن ادھر ادھر بھٹک رہا تھا مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا۔

ہفتے میں مسلسل دو راتیں یہ آوازیں آتی تھیں ایک رات دلدوز آواز اور دوسری رات بڑی مترنم اور لہک چہک والی۔ پہلے دن لگتا کہ کوئی سینہ فگار ہے جس کو دنیا کا سب سے بڑا درد ملا ہے جسے برداشت کرنے کی اس میں سکت نہیں ہے اور وہ اس غم کو زار وقطار اور دہاڑیں مار مار کر، رو رو کر بہا دینا چاہتی ہے۔ لیکن دوسرے دن ایسی آواز ہوتی کہ جیسے موسم بہار ہو اور نو خیز لڑکی، گیت کے ذریعہ اپنے عنفوان شباب کے جذبات کا اظہار کر رہی ہو۔ خیر دھیرے دھیرے یہ معمول بن گیا اور میں ان دونوں آوازوں کا نہ صرف عادی ہوگیا بلکہ انتظار بھی رہتا مگر پہلے دن کا نہیں، لیکن مشکل یہ تھی کہ پہلا دن گذرے بغیر دوسرا دن نہیں آتا اس لئے مجبوراً اسی کا انتظار ہوتا۔

ہفتہ، دس دن میں دو راتیں میری ایسی گذرتی تھیں جب میری نیند نہیں پوری ہو پاتی۔ پہلی رات آواز کی ہولناکی اور خوف کی بنا پر اور دوسری رات اس کی خوبصورتی، کھنک اور شوق سماعت کی وجہ سے۔ ایک دن میں نے سوچا کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ جس طرف سے آواز آرہی ہے جا کر دیکھا جائے تاکہ اس آواز کی حقیقت معلوم ہو کہ کہاں سے آرہی ہے اور اگر کوئی

انسان ہے تو بھلا کیوں؟ لیکن اس کے لئے میں نے دوسری رات کو منتخب کیا کیونکہ اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ خوف سے بے نیاز ہو کر میں نے عزم مصمم کرلیا کہ اس بار بہرصورت مجھے جانا ہے اور اس آواز کا پتہ لگانا ہے۔ اب ایک مسئلہ یہ تھا کہ تنہا جاؤں کیسے ؟ مکان کے پیچھے کا جو علاقہ تھا وہ نہ صرف جنگل اور غیر مسطح تھا بلکہ تھوڑا زیادہ آگے جانے پر کھنڈرات تھے۔ میں نے آواز کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا اس لئے مجھے تنہا ہی جانا تھا۔ جس رات رونے کی آواز آئی میں دوسرے دن ٹارچ خرید لایا اس کے ساتھ ہی ایک رین کوٹ بھی خرید لیا تا کہ جھاڑیوں میں سے گذرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔ اس سے قبل میں دن میں جنگل میں جا کر ایک بار ٹہل آیا تھا اور راستہ بھی دیکھ لیا تا کہ رات میں آسانی رہے۔

آج جلدی دفتر سے واپس آیا اور کھانا کھا کر تھوڑا آرام کرنے لگا تا کہ تازہ دم رہوں لیکن ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں سو نہ جاؤں جو پھر ایک ہفتہ کا انتظار کرنا پڑے اس لئے ٹی وی آن کر دیا تا کہ اس کی آواز سے نیند غالب نہ ہو اور تھوڑی دیر بعد اٹھ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

اچھا خاصہ وقت گذر گیا تو ٹی بند کیا اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ دیکھ تو میں لیپ ٹاپ رہا تھا مگر میرے کان آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کافی دیر کے بعد ایک آواز گونجی اور میں نے اچھل کر لیپ ٹاپ کو خود سے دور کر دیا۔ جلدی جلدی رین کوٹ پہنا، ہاتھ میں ٹارچ سنبھالی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی، اس کے باوجود میں جلد بازی میں تھا۔ جب تیزی سے دو تین زینہ اترا اور اس کی آواز گونجی تو میں نے خود پر قابو پایا اور اپنی چال کو متوازن کرلیا تا کہ گھر سے باہر خدانخواستہ اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو اس کو کسی طرح کا کوئی شک نہ ہو۔ میں دروازے سے نکلا اور عقبی حصے سے ہوتے ہوئے اس پگڈنڈی پر آ گیا جو جنگل کے اندر جاتی تھی۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا مگر جوں جوں میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے اس میں لرزش پیدا ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ میں آگے بڑھ رہا تھا مگر آواز قریب نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ جتنے پر تھی اسی جگہ رکی ہوئی تھی۔ جب تقریباً ایک کلومیٹر سے کچھ کم فاصلہ جنگل میں طے کر چکا تو آواز پہلے کے مقابلے تھوڑی دور محسوس ہونے لگی۔ اب ایک بار پھر ذہن میں سوال کلبلایا کہ اسے تو قریب ہونا چاہئے لیکن یہ قریب ہونے کے بجائے مزید دور ہو رہی ہے اور قدم رک گئے۔ میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہونا چاہئے پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ کم از کم ان کھنڈرات تک تو جانا ہی چاہئے کیونکہ غالب امکان یہی تھا کہ آواز وہیں سے آ رہی ہوگی مگر سمت کا تعین آواز سے نہیں ہو رہا تھا اس لئے میں نے پہلے ہی کھنڈرات کی طرف جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس میں تزلزل اس لئے آیا کیونکہ آواز قریب ہونے کے بجائے دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میں افتاں و خیزاں کھنڈرات تک پہنچ گیا لیکن میرے دل کی دھڑکن بہت تیز چل رہی تھی حالانکہ جب یہاں پہنچا تب بھی آواز کی دوری اتنی ہی محسوس ہوئی مگر طرفہ تماشہ یہ کہ میرے یہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد آواز بند ہوگئی۔ اب ایک بار پھر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اب اگر آگے جانا بھی چاہتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے لاچار و ناچار واپس آنا پڑا۔

واپسی کے دوران سردی ہونے کے باوجود میں پسینے میں شرابور تھا۔ ایک طرف میرا مقصد نہیں حاصل ہوا تھا تو دوسری طرف آواز بھی بند ہوگئی تھی۔ اس لئے میں سوچ میں غرق تھا اور آئندہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اب کی بار کیا کروں جو اس آواز کا راز پالوں۔

یہ آواز میرے لئے ایک راز تھی، کسی دوسرے نے کبھی اسے سنا یا نہیں مجھے نہیں معلوم مگر میں اسے سن رہا تھا اور مسلسل سن رہا تھا مگر اس کی حقیقت سے نا آشنا تھا۔ مجھ پر ایک جنون سا سوار تھا کہ بہرصورت اس آواز کے راز کو جاننا ہے لیکن ہر چیز اپنی قدرت اور اپنے بس میں تو ہوتی نہیں ہے۔ کسی طرح اگر پہنچ بھی گیا تو آواز ہی بند ہوگئی۔ اس لئے راستے میں ہی سوچ لیا تھا کہ اگلی بار آواز آنے کا اندازہ لگا کر اس سے پندرہ ،بیس منٹ پہلے ہی گھر سے نکل لوں گا تا کہ آواز کے شروع ہونے سے قبل میں ان کھنڈرات تک پہنچ جاؤں اور پھر آگے کا راستہ طے کروں۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا۔ اجالا اپنے وجود کا احساس کرانے لگا تھا اور پو پھوٹنے ہی والی تھی۔

ایک ہفتہ تک معمول کے مطابق زندگی گذرتی رہی، پہلی رات بین کی آواز سنائی دی اور دوسری رات کے لئے میں تیار پہلے سے ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اتنے دنوں میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آواز کب آنی شروع ہوتی ہے اس لئے اس سے تقریباً پندرہ بیس منٹ پہلے ہی نکل لیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ میں کھنڈرات تک پہنچا اور کافی دیر تک بیٹھا انتظار کرتا رہا اس درمیان میں نے تین سگریٹ بھی پھونک ڈالے۔ میرے کان ہرنوں کی طرح کھڑے تھے، اگر پتہ بھی کھڑکتا تو کھٹ سے میں اس طرف مڑ جاتا۔ میں سراپا انتظار تھا مگر آواز تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ دھیرے دھیرے میں پریشان ہونے لگا کہ یہ کیا ہوا؟ معمول کے مطابق آواز کی آمد کافی پہلے شروع ہو جانی چاہئے تھی مگر یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ انتظار کا وقفہ طویل تر ہوتا گیا اور آخر میں نا امید ہو گیا۔ میں بیٹھا سوچ رہا تھا اب کیا کروں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بالآخر واپس چلا آیا۔

دوسرے دن تھکن اور رات میں نہ سونے کی وجہ سے سر بہت بوجھل تھا۔ دفتر میں ہی کسل مندی چھائی ہوئی تھی اس لئے بغیر کھانا کھائے ہی سو گیا۔ میں گہری نیند میں تھا کہ ایک نقرئی آواز نے مجھے پکارا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک لڑکی کھڑی تھی جو

اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھی۔اگر وہ اپنی آواز کی طرح خوبصورت تھی تو مجھے آج بھی اسے نہ دیکھ پانے کا افسوس ہے۔وہ مجھ سے تھوڑا دوری پر کھڑی تھی،اس نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

یہ دنیا کیا ہے ایک جنگل اور انسان کیا ہے ایک کھنڈر،اس جنگل میں بہت سے کھنڈر ہیں جہاں سے بہت سی آواز آتی ہیں،آپ ان کے پیچھے کیوں نہیں دوڑتے، ایک صرف میری آواز کے پیچھے پڑے ہیں۔کیا ملے گا آپ کو،اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟اس طرح آواز کے پیچھے پڑنے سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اس نے تھوڑا میرے قریب آتے ہوئے کہا۔سنئے اپنا کام دیکھئے،زندگی کو آگے بڑھایئے،اس آواز کے پیچھے مت پڑیئے جس سے نہ کچھ آپ کو ملے گا نہ مجھے۔

پھر ایک دم سے اس کی آواز تیز ہوگئی، ایسا لگ رہا تھا کوئی آسمان ہے جو برس رہا ہے،وہ کہہ رہی تھی۔کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرا وہ درد جو میرے سینے میں ہے، باہر بھی نہ نکلے،اگر ایسا ہوا تو میرا سینہ پھٹ جائے گا۔خدا کے لئے اب ایسی غلطی دوبارہ مت کریئے گا اور واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔میں جو ابھی تک اس کی بات خاموشی سے سن رہا تھا اور سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔فوراً آگے بڑھا اور اس کو روکنے لگا۔ہاتھ تو لگا نہیں سکتا تھا اس لئے اس کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس سے سوال کر لیا۔مسئلہ کیا ہے اور آپ ہیں کون؟ میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی؟

اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور بولی کل آپ نے ہی میرا گلا بند کر کے سینہ فگار کیا۔اگر آپ اس آواز کے چکر میں وہاں تک نہ جاتے تو میں یہاں نہ آتی۔

میں اس کی باتیں سن کر خواب میں اچھل پڑا اور میرے منہ سے نکل گیا۔''کیا''

میں حیرت زدہ تھا کہ جس کی تلاش میں رات بھر صحرا نوردی کرتا رہا،وہ میرے پاس ہی

میں حیرت زدہ تھا کہ جس کی تلاش میں رات بھر صحرا نوردی کرتا رہا،وہ میرے پاس ہی موجود ہے اور اہم بات یہ کہ پوری مجسم ہے جسے میں دیکھ سکتا ہوں اور چھو کر محسوس کر سکتا ہوں۔میں حیرت و استعجاب کا مجسمہ بنا کھڑا تھا اور وہ میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔میں نے کہا اگر آپ وہی ہیں تو مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور میری تمنا پوری ہوئی لیکن وہ گیت جو آپ نے کل نہیں سنایا تھا، پہلے وہ سنایئے پھر اس کے بعد اور بہت سی باتیں کروں گا۔

اس نے کہا میں گیت سنانے نہیں آئی ہوں، میں آپ کو سمجھانے آئی تھی کہ اس طرح کی غلطی نہ کریں ورنہ مجھے تو پریشانی ہوگی ہی آپ بھی پریشانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔

میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بولے کیونکہ اس کی آواز ہی تو تھی جس نے مجھے رات میں بیابان کی خاک چھاننے پر مجبور کیا تھا۔بھلا روتی اور منہ بسورتی آواز کسے پسند ہے اس لئے جب پہلے دن رونے کی آواز آئی تو جانے کے بارے میں سوچا تک نہیں لیکن دوسرے دن اس کی سحر سامری والی آواز نے تو مجھے اپنی لپیٹ میں ایسا لیا کہ میں پورے پورے ہفتہ اس کا انتظار کرتا اور اس رات سوتا نہیں کہ مجھے آواز سننا ہے اور آج وہ میرے سامنے تھی اس لئے میں چاہتا تھا کہ اس سے وہ گیت سنوں جو وہ گایا کرتی تھی مگر دوری کی وجہ سے میں سمجھ نہیں پاتا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔

موجود ہے اور اہم بات یہ کہ پوری مجسم ہے جسے میں دیکھ سکتا ہوں اور چھو کر محسوس کر سکتا ہوں۔میں حیرت و استعجاب کا مجسمہ بنا کھڑا تھا اور وہ میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔میں نے کہا اگر آپ وہی ہیں تو مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور میری تمنا پوری ہوئی لیکن وہ گیت جو آپ نے کل نہیں سنایا تھا، پہلے وہ سنایئے پھر اس کے بعد اور بہت سی باتیں کروں گا۔

اس نے کہا میں گیت سنانے نہیں آئی ہوں، میں آپ کو سمجھانے آئی تھی کہ اس طرح کی غلطی نہ کریں ورنہ مجھے تو پریشانی ہوگی ہی آپ بھی پریشانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔

میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بولے کیونکہ اس کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔اس کی آواز ہی تو تھی جس نے مجھے رات میں بیابان کی خاک چھاننے پر مجبور کیا تھا۔بھلا روتی اور منہ بسورتی آواز کسے پسند ہے اس لئے جب پہلے دن رونے کی آواز آئی تو جانے کے بارے میں سوچا تک نہیں لیکن دوسرے دن اس کی سحر سامری والی آواز نے تو مجھے اپنی لپیٹ میں ایسا لیا کہ میں پورے پورے ہفتہ اس کا انتظار کرتا اور اس رات سوتا نہیں کہ مجھے آواز سننا ہے اور آج وہ میرے سامنے تھی اس لئے میں چاہتا تھا کہ اس سے وہ گیت سنوں جو وہ گایا کرتی تھی مگر دوری کی وجہ سے میں سمجھ نہیں پاتا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا،اس لئے میں اب اسی پر قانع ہو گیا تھا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں،خواہ وہ کچھ بھی بولے۔

میں نے پھر اس سے ایک سوال کیا۔اچھا یہ بتائے کہ ہفتہ میں دو دن ہی کیوں آواز آتی ہے حالانکہ میں ایک دوسرا سوال کرنے جا رہا تھا جو اس سے زیادہ اہم تھا مگر میں نے کسی وجہ سے وہ پوچھنے کے بجائے یہ سوال کر دیا۔

وہ جو ابھی تک نگاہیں نیچے کئے ہوئے تھی،سر اوپر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

آپ کو اس میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟

میں نے کہا کیوں کہ میں سنتا ہوں،اس لئے

جاننا چاہتا ہوں، پتہ نہیں کیسے اور کتنے بدذوق ہیں اس بستی کے لوگ، جو اتنی خوبصورت آواز سنتے ہیں مگر خاموش ہیں، کبھی کسی کو اس سے متعلق بات کرتے ہوئے نہیں سنا، مجھے سخت افسوس ہے۔

اب جانے کے بجائے وہ ایسے کھڑی ہوگئی جیسے خود رکنا چاہتی ہو۔اس نے اپنا داہنا ہاتھ پیٹ پر اس طرح رکھا کہ اس کی ہتھیلی پیٹ کے بائیں طرف پہنچ گئی اور بایاں ہاتھ اٹھا کر ٹھوڑی سے لگالیا، وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا ''اچھا'' مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کوئی جواب دے تاکہ اس کی آواز سن سکوں۔اس لیے میں نے دوسرا سوال کر لیا۔

اچھا یہ بتایئے ایک رات رونے اور ایک رات ہنسنے کی آواز کیوں آتی ہے؟

اس نے اب کی بڑے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا آپ سوال بہت کرتے ہیں۔آپ سے جو کہا ہے اس پر عمل کریئے ورنہ نقصان میں رہیں گے۔میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاسکتی۔

یہ کہہ کر وہ چل دی۔

میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئیکہا، دیکھئے اگر میرے اس سوال کا جواب نہیں دیں گی تو میں پھر آؤں گا۔خواہ کتنا بڑا نقصان کیوں نہ ہوجائے۔

اس نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ٹھیک ہے، نہ مانئے، ایک بار مری ہوں، دوبارہ پھر مرجاؤں گی مگر اتنا سن لو، اگر ایسا ہوا تو بخشوں گی نہیں۔

اس کی اس دھمکی سے میں ذرا سہا لیکن خاطر جمع کرتے ہوئے میں نے کہا، اچھا اگر بتادیں گی تو کیا نقصان ہوجائیگا اور ہاں اگر آپ نے بتادیا تو میں کبھی اس طرف نہیں آؤں گا، یہاں تک کہ اگر آپ کہہ دیں گی تو یہ جگہ بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن آپ بتائیں۔آپ نہیں جانتی ہیں کہ میں رونے کی آواز اور اس کا درد سن کر کانپ جاتا ہوں، زندگی بے معنی

میر انیس نمبر

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔انہیں میں سے ایک 'میر انیس نمبر' بھی شامل ہے۔ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔اس کی قیمت ۱۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملاکر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

لگنے لگتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ غم نے مجھے بھی اپنی چادر میں لپیٹ لیا ہے اگر یہ بین مجھ پر اتنا اثر انداز ہے تو جو بین کر رہا ہے اس کے اندر کتنا درد ہوگا لیکن دوسرے دن جب شعلہ کی طرح آواز لپکتی ہے تو زندگی رقص کرنے لگتی، وہ ہزار رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اپنی پوری رعنائیوں اور اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ عود کر آئی ہے۔اس لئے میں اس بین اور رقص کرتی زندگی کا راز جاننا چاہتا ہوں۔

اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا آپ بہت ڈھیٹ ہیں۔

میں بھی اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔میں پہلے ذرا دوری پر کھڑا تھا مگر اب اس کے کافی قریب ہوچکا تھا۔

اس نے کہا یہ آنکھیں تو بہت چھوٹی چھوٹی ہیں مگر ان میں بلا کی ہمت ہے۔اور بڑی خوبصورت بھی، چلو میں ان آنکھوں کا احترام کرتے ہوئے تھوڑا سا بتائے دیتی ہوں کیونکہ کہانی بہت طویل ہے لیکن اس کے بعد ضد مت کرنا۔

میں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔

اس نے جواب دیا۔یہ آخری موقع ہے۔اس کے بعد میں چلی جاؤں گی پھر آپ جانیں اور آپ کا کام جانے، میں جس لئے آئی تھی وہ کہہ چکی۔

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔اچھا ٹھیک ہے سنایئے۔

وہ کہنے لگی، زیادہ دن نہیں ہوئے ہم بھی بہت خوشی خوشی زندگی کرتے تھے مگر کچھ ایسا زندگی میں رونما ہوا کہ ساری خوشیاں کافور ہوگئیں اس لئے جب خوشی کے دن یاد آتے ہیں تو گیت گاتی ہوں، رقص کرتی ہوں اور جب برے دن یاد آتے ہیں تو روتی ہوں اور بین کرتی ہوں۔

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگئی۔

میں نے کہا مگر خوشی کس بات کی تھی اور غم کس بات کا؟

اس نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔

آپ واقعی بہت عجیب انسان ہیں۔میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس کے بعد سوال مت کرنا مگر آپ مانیں گے کہاں۔

میں سوچ رہا تھا کہ ابھی بتایا ہی کیا ہے، اتنا تو بغیر بتائے میں ہی کیا ہر کوئی جان سکتا ہے۔

اس لئے میں نے بھی تھوڑی برہمی سے جواب دیا۔

عجیب میں نہیں، آپ ہیں۔بتاتی بھی ہیں اور نہیں بھی۔یہ کون سی بات ہوئی۔

میری بات کا اثر ہوا اور اس کے لب ایک بار پھر نور کی بارش کرنے لگے۔

اس نے کہنا شروع کیا، دراصل آپ لوگ صرف آوازوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، ان کی حقیقت کا ادراک نہیں چاہتے، آپ جو رقص کرتی آواز سنتے ہیں، وہ دراصل خوشی نہیں اور جو بین کرتی آواز سنتے ہیں وہ غم نہیں۔یہ تو زندگی کے دو رنگ ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ یہ آوازیں خود آپ کے اندر سے آرہی ہیں، جبکہ میری تجسیم آپ کا ہی وجود ہے اور آپ ان کو باہر تلاش کر کے مجھے یعنی خود کو ہی پریشان کرتے ہیں۔

وہ بولے جارہی تھی اور میں ساکت وجامد صرف سن رہا تھا۔

آپ آواز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں، اپنے اندر جھانکئے، اپنے اردگرد دیکھئے، جنگل تک آنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے سرچشمے آپ کو اپنے آس پاس ہی مل جائیں گے۔

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔میں اس کی آواز کے سحر میں گرفتار بس اس کی آنکھوں میں دیکھے جارہا تھا کیونکہ چہرہ چھپا ہوا تھا، ورنہ میری نگاہ بار بار بھٹک اس کے لبوں پر ہوتی۔میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا تھا اس لئے میں ملتجی نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔میں نے کہا لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں؟

اس نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، آپ بالکل گدھے ہیں، ابھی تک آپ نہیں سمجھ سکے۔اتنی دیر سے میں اور کیا بتا رہی تھی۔

آپ یہ سب اپنی خوشی کے لئے پوچھ رہے ہیں نا حالانکہ اس سے آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔میرے وجود سے آگاہی آپ کی زندگی کو کیا موڑ دے سکتی ہے جو اس قدر پیچھے پڑ گئے ہیں۔اگر اس سے فائدہ اٹھانا ہے تو میرے وجود کو جاگتی آنکھوں سے تلاش کرنا وہاں ساز بھی ہوگا اور آواز بھی ہوگی لیکن آپ تو رات اور خواب کے عادی ہیں بس زندگی کو اسی میں تلاش کرتے ہیں جہاں زندگی نہیں ہے۔

میں اس کی اس فلسفیانہ باتوں کو نہیں سمجھ پا رہا تھا اس لئے میرے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی جسے میں ضبط کر رہا تھا۔لیکن کہاں تک ضبط کرتا آخر پھر ایک سوال کر دیا لیکن اس بار میرا لہجہ ذرا سخت تھا۔

تو آپ نہیں بتائیں گی، بس گول مول باتیں کریں گی؟

اس نے ہونٹ اور بھنویں اس طرح سکوڑیں کہ آنکھیں چھوٹی ہوگئیں اور اوپر والا ہونٹ سکڑ کر ناک تک پہنچ گیا اور مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

جس طرح آپ اپنی خوشی کے لئے مجھے پریشان کرتے ہیں اسی طرح میں نے بھی اپنی خوشی کے لئے کسی کی پروا نہیں کی اور خوشی کے اس سرچشمے سے ہمکنار ہوئی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میں اپنی خوشی کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی جو کر کے دکھایا۔ایسے لوگوں کو بھی میں نیکنارے کر دیا جن کی میری زندگی میں بڑی اہمیت تھی مگر جب وہ میری خوشی سے متصادم ہوئے تو تاش کے پتوں کی طرح انہیں بھی بکھیر کر رکھ دیا اور اپنی خوشی حاصل کر لی۔اتنا کہہ کر ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوئی اور پھر بولی۔بس اتنا سمجھئے کہ خوشی اور غم زندگی کے دو رنگ ہیں۔جن کے مابین انسان جھولے کی طرح جھولتا رہتا ہے کسی کو دوام حاصل نہیں۔خوشیاں اور غم انسان کی زندگی میں بہت تھوڑی دیر کے لئے آتے ہیں اور انسان انہیں تا عمر کی خوشیاں سمجھ بیٹھتا ہے اور یہی غلطی میں نے کی تھی۔

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی، اس کے طویل سکوت پر میں نے کہا لیکن آپ نے تو آواز کا راز بتایا ہی نہیں اور نہ ہی اپنی حقیقت کے بارے میں۔

یہ سنتے ہی وہ چیخ پڑی اور چلا کر بولی۔

نہ آپ خوش رہنا چاہتے ہیں اور نہ دوسروں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ارے سب کچھ تو بتا دیا اب بچا ہی کیا ہے لیکن آپ ایسے کہاں مانیں گیا آپ کو تو دلیلیں چاہئے لائیے ادھر ہاتھ اور مجھے چھو کر دیکھ لیجئے۔اتنا کہہ کر اس نے خود اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہاتھ کے مس ہوتے ہی اس کا وجود ایک دم سے پگھل گیا اور میں ارے ارے کرتا رہ گیا پھر ایک ساتھ رونے اور ہنسنے کی آوازوں سے میرا کمرہ گونج اٹھا۔اس شور سے میری آنکھ کھل گئی۔میں پسینے سے شرابور تھا اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے مگر ایسا لگ رہا تھا کہ ہر طرف سے بس آوازیں ہی آوازیں آرہی ہیں۔جن سے بچنے کے لئے میں نے دروازہ کھولا اور گھر سے جنگل کی طرف نکل گیا۔

اب بھی میں ان آوازوں کے تعاقب میں ہوں، ایسا لگتا ہے میں جنگل میں ہوں اور وجود کھنڈر ہے، ان ہی دونوں میں سے کسی سے اس کی آوازیں نکل کر میرے کانوں میں آج بھی گونجتی ہیں اور میں اپنے آس پاس اس کو تلاش کر رہا ہوں۔دیکھو! کب تک تلاش جاری رہتی ہے۔

❑❑❑

غزل

میں خاک تھا خمیر سے یکجا کیا گیا
پھر روح پھونک کر مجھے سجدہ کیا گیا

دے کر فریب دانۂ گندم بہشت میں
'مجھ کو اسیرِ دام تمنا کیا گیا'

میری خموشیوں میں صدائیں رکھی گئیں
میں منجمد تھا سو مجھے دریا کیا گیا

سورج سے کم نہیں تھی مرے نور کی بساط
لیکن گھٹا گھٹا کے میں ذرہ کیا گیا

دریا پہاڑ چاند ستارے زمیں فلک
اِن سب کو میری ذات میں یکجا کیا گیا

چیونٹی کی چال شیر کی ہیبت ہرن کی آنکھ
ہر ایک کی صفت کو اکٹھا کیا گیا

پھر کوزہ گر نے توڑ دیا اپنے چاک کو
اِس بزم میں کسی کو نہ مجھ سا کیا گیا

سلمانؔ عابدی
علی پور، چک بلّا پور (کرناٹک)
موبائل: 9916733603

غزل

یوں تو ناچیز ہوں غریب ہوں میں
پھر بھی انکے بہت قریب ہوں میں

بولتا سچ ہوں اس زمانے میں
آدمی کس قدر عجیب ہوں میں

بولتا ہوں فرازِ نیزہ سے
منبر عشق کا خطیب ہوں میں

اپنے دشمن سے پیار کرتا ہوں
اپنی ہی ذات کا رقیب ہوں میں

ہیں مریضوں میں میرے عیسیٰ بھی
ایسا اعلیٰ صفت طبیب ہوں میں

خوش نوائی پہ یوں نہ ہو حیراں
انکے گلشن کا عندلیب ہوں میں

خوں سے لکھتا ہوں داستانِ حیات
ایسا کوثرؔ میاں ادیب ہوں میں

کوثرؔ سلطانپوری
سلطانپور
موبائل: 8737061586

غزل

اجداد نے جو دی تھی حکومت کہاں گئی
میں دھوپ میں کھڑا ہوں مری چھت کہاں گئی

سوچو، دلوں میں تلخیاں کس نے اتار دیں
رشتوں سے اپنے پن کی حلاوت کہاں گئی

ممتا کے زیورات سے آراستہ جو تھی
ماں جس کا نام تھا وہی عورت کہاں گئی

ننگی ہے بے حیائی کے رنگیں لباس میں
اے حسن باحیا تری غیرت کہاں گئی

دھندلا ہے کیوں یہ فن کی متانت کا آئینہ
اپنے ہنر کی وہ قد و قامت کہاں گئی

نمکین حسن نے تو نہیں چھیڑ چھاڑ کی
زخموں کی وہ نمائشی عادت کہاں گئی

اب پرسکون لیٹے ہو اپنے مزار میں
فطرت میں تھی جو رازؔ وہ عجلت کہاں گئی

رازؔ ساغری (راعین)
نشاط منزل، ٹیکری محلہ، کھرگون، ایم پی
موبائل: 8435226705

غزل

اکثر سنا ہے راہِ وفا کے قتیل سے
اُبھرا نہ ڈوب کر کوئی آنکھوں کی جھیل سے

منصف مزاج شخص اگر حکمراں نہ ہو
انصاف خاک ہوگا ثبوت و دلیل سے؟

اُس سے نوازشوں کی توقع فضول ہے
حق بھی نہ مل رہا ہو یہاں جس ذلیل سے

ساقی سے ہم کو ایک بھی قطرہ نہ مل سکا
تم کو اُمید ہو تو ہو ایسے بخیل سے

فرعون غرق ہو گیا موسیٰ نکل گئے
رستہ خدا نے دے دیا دریائے نیل سے

کہنے سے تیرے رات کو دن وہ بھی مان لے
ایسی توقع رکھ نہ فہیم و عقیل سے

اُٹھتی نہیں نگاہ کسی اور کی طرف
مخمورؔ مطمئن ہے دلِ خود کفیل سے

مخمور کاکوروی
چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
موبائل: 9450097929

غزل

غزلوں میں رنگ و نور کی سوغات چاہئے
سوکھی ہوئی زمین کو برسات چاہئے

کردار چاہئے نہ ہمیں ذات چاہئے
دو روٹیوں کی بھوک کو خیرات چاہئے

بستی کا ہو سوال کہ ہستی کی بات ہو
کچھ احتیاطِ صورتِ حالات چاہئے

تیری خوشی ہو یا کہ ہو تیرا عمیق غم
نوحہ گرانِ ہجر کو سوغات چاہئے

اندازِ گفتگو ہو کہ تخیل کا حسن ہو
ہر شعر میں اے دوست نئی بات چاہئے

دست طلب دراز ہے جو بعد مرگ بھی
اس کو تمہارے دید کی خیرات چاہئے

روشنؔ تری طلب کا کہیں کچھ جواب ہے
بے چہرہ آئینے سے ملاقات چاہئے

روشن لال روشنؔ
ایشور گنگی کنڈ، وارانسی
موبائل: 7081824644

غزل

ہم کسی طور نہ احسانِ ہوا لیتے تھے
بس چراغوں سے چراغوں کو جلا لیتے تھے

بات بگڑی ہوئی کیسی ہو بنا لیتے تھے
جب عقیدت سے بزرگوں کی دعا لیتے تھے

کوئی آجاتا تھا جب حفظ و اماں میں میری
چاہے دشمن بھی ہو سینے سے لگا لیتے تھے

نوحہ گر تھے نہ ترے مدح سرا تھے ہم تو
تیرے چہرے سے بس اندازہ لگا لیتے تھے

اس کی راہوں میں ستارے تھے گہر تھے لیکن
ہم خذف ریزوں کو آنکھوں میں بسا لیتے تھے

ہم نے جس خواب کی تعبیر نہ پائی مدہوشؔ
رات آتے ہی وہی خواب سجا لیتے تھے

مدہوشؔ بلگرامی
۲۲۴، بہیرا سوداگر مشرقی، ہردوئی
موبائل: 87261989282

غزل

ہم تو کبھی ایسے نہ تھے یہ کیا ہوا 'دیوانگی'
سادہ سی اک پہچان، کیوں الجھی بتا 'دیوانگی'

مندر میں جا، مسجد میں جا، گرجے میں جا، مرضی تری
تیرا خدا تیرے لئے میرا خدا 'دیوانگی'

کچھ یار میرے پارسا ناراض ہیں دشمن بھی ہیں
ملحد ہوں میں ان کے لئے میری خطا 'دیوانگی'

اس شہر میں اک شخص تھا انجان سا ویران سا
مجھ سے بہت مانوس تھا ہے لا پتا 'دیوانگی'

وہ قیس ہو، فرہاد ہو، میرا ہو یا منصور ہوا
وہ ہے امر جادو ترا جس پر چلا 'دیوانگی'

کل شب مجھے اک شخص نے آئینے میں گھورا بہت
پوچھا بتا تو کون ہے اس نے کہا 'دیوانگی'

یہ درد و غم یہ شاعری حیرتؔ اسی کی دین ہے
ممنون ہوں مشکور ہوں کیا کیا دیا 'دیوانگی'

حیرتؔ فرخ آبادی
کھوسلا ہاؤس، نارتھ آفس پاڑہ، ڈورنڈہ، رانچی
موبائل: 9431917878

غزل

گھر سے نکلو تو رکھ لو جیب میں اپنا پتہ
کون جانے رونما ہو جائے کب کیا حادثہ

خون کے چھینٹے بتا دیتے ہیں قاتل کا پتہ
لاکھ پردوں میں وہ خود کو گر چھپائے بھی تو کیا

جو عمل سے کھو چکے ہیں اپنے چہروں کی شناخت
کاش ان لوگوں کو بھی مل جائے کوئی آئینہ

وہ ترقی کے منازل سے نہ ہوں گے ہم کنار
جو نہیں رکھتے عمل سے دور کا بھی واسطہ

یوں ہمیں بچھڑے ہوئے تم سے زمانہ ہو گیا
دیکھتی ہیں آج بھی آنکھیں تمہارا راستہ

کر عطا صبح نشاط افزا کہ شامِ درد و غم
حاصل صد زندگی ہے جس میں ہو تیری رضا

جو رہا سینہ سپر ظلمات سے تا زندگی
قابل تحسین ہے شاداںؔ وہ مٹی کا دیا

شاداںؔ سلطانپوری
بھٹی جرولی، کٹاواں، سلطانپور
موبائل: 9453769547

غزل

عارض و لب ہیں وہی وقت ذرا کیا بدلا
رُخ نظر آنے لگا پھولوں کا بدلا بدلا

انقلاب اور کسے کہتے ہیں معلوم نہیں
فکر تبدیل ہوئی چہروں کا نقشہ بدلا

بلبلوں کا ہو ترنم کہ تبسم گل کا
کچھ نہ کچھ سب کا ہی انداز نوا کا بدلا

وقت منصف ہے مرے ساتھ بھی ہوگا انصاف
وقت اک روز مرے خون کا لیگا بدلا

کسی منزل پہ بھی پہنچے نہ بچارے رہرو
رہنما بدلے گئے تو کبھی رستہ بدلا

کچھ تو پہلا سا نہیں عالم گل کا منظر
کچھ مرا زاویہ بھی فکر و نظر کا بدلا

شاخِ پژمردہ سے پھوٹی نئی کوپل کوثرؔ
تم جو آئے تو چمن لگتا ہے بدلا بدلا

کوثرؔ صدیقی
A-79، گنوری، مین روڈ، بھوپال
موبائل: 99264404171

غزل

بیچ میں اپنی نظر حائل ہے چلمن کی طرح
ورنہ وہ تو روبرو ہے شمع روشن کی طرح

حادثوں نے مل کے لوٹا زندگی کا رنگ و روپ
ورنہ سر تا پا حسیں تھی یہ بھی دلہن کی طرح

میں بہاروں سے نہیں مجھ سے بہاروں کا ہے حسن
میں نے تو صحرا کو مہکایا ہے گلشن کی طرح

زندگی میں اب کوئی کس کو بنائے ہم سفر
ساتھ چلنے والے جب پیش آئیں رہزن کی طرح

مجھ پہ تہمت رکھنے والوں آنکھیں ہوں تو دیکھ لو
پاک ہے دامن مرا یوسف کے دامن کی طرح

اسکے قدموں کی ہے آہٹ جس سے ہم ہیں بے خبر
یہ جو اک آواز سی ہے دل میں دھڑکن کی طرح

قید میں بھی ہر طرح کی عافیت حاصل ہے رازؔ
ہم قفس کو بھی سمجھتے ہیں نشیمن کی طرح

رازؔ اعظمی
سبز پوش ہاؤس، جعفرابازار، گورکھپور
موبائل: 9795917970

غزل

زندگی نے آج تک اپنا مجھے سمجھا نہیں
اس لئے تو مجھ کو اس سے کوئی بھی شکوہ نہیں

مدتوں دیتا رہا جو زندگانی کی نوید
اس شجر کی شاخ پہ اب ایک بھی پتہ نہیں

زندگی کی تلخیوں سے سامنا کرنے کے بعد
دل یہ کہتا ہے کسی سے اب مرا رشتہ نہیں

دوستی کی کھڑکیوں سے آنے دیں تازی ہوا
دشمنی میں چین سے انسان جی پاتا نہیں

دھیرے دھیرے بجھ رہے ہیں آس کے جگنو تمام
دل کو جس کی ہے تمنا وہ ابھی آیا نہیں

چلتے چلتے ایک دن منزل تک آیا ہے ضرور
جس نے ماضی کی طرف مڑ کے کبھی دیکھا نہیں

ہے بہت دشوار تابشؔ سچ کا کرنا سامنا
بس اسی باعث تو میں نے آئینہ دیکھا نہیں

طلحہ تابشؔ
گلی سیتارام، اسٹیشن روڈ، پرتاپ گڑھ
موبائل: 9044676517

غزل

کہیں سے چھپ کے کہیں پر نکل کے دیکھتے ہیں
تمہاری سمت ستارے سنبھل کے دیکھتے ہیں

یہ کس نے دے دیا ایثار کا لہو ان کو
چراغ سارے ہواؤں میں جل کے دیکھتے ہیں

بلا کا حسن عنایت ہوا ہے ظالم کو
نظر کے ساتھ ہی دل بھی اچھل کے دیکھتے ہیں

ہمارا شوق جنوں انتہا پہ ہے شاید
گلوں کے بعد شراروں پہ چل کے دیکھتے ہیں

مزید گردش دوراں کے ساتھ چلنے کے بعد
تمہارے ساتھ بھی کچھ دور چل کے دیکھتے ہیں

اندھیری شب کے اندھیرے ہزار گہرے ہوں
یہ ننھے ننھے سے جگنو نگل کے دیکھتے ہیں

ادب جو وقت کے سانچے میں ڈھل گیا نجمیؔ
تو رنگ رنگ کے چہرے غزل کے دیکھتے ہیں

اشفاق نجمیؔ
حسین آباد، حیدری چوک، کامٹی
موبائل: 9555417397

ایک یادگار جشن

اردو نواز گورنر عزت مآب جناب رام نائک جی کی 'جشن شارب' میں خصوصی شرکت

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک جی کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے جناب خان احمد فاروق پروفیسر شارب ردولوی کو ڈاکٹر محمد کاظم (دائیں جانب) اور جسٹس شبیہ الحسنین کو پروفیسر شہزاد انجم (بائیں جانب)

۲؍دسمبر ۲۰۱۸ء کو عزت مآب گورنر رام نائک جی نے یوپی کے دل لکھنؤ میں ایک تاریخ ساز جشن کا افتتاح کیا، یہ موقع تھا سہ روزہ 'جشنِ شارب' کا۔ لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب کے دلدادہ رام نائک جی خود ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ تاریخی شخصیت بہ ایں معنی کہ گذشتہ پانچ برسوں میں انھوں نے اہلِ لکھنؤ کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ انسانیت کے علم بردار، مہربان و مشفق کون سی خوبی ہے جو ان میں موجود نہیں، وہ ایسا دریائے محبت ہیں جس کا فیضان ہر خاص و عام کے لیے جاری ہے۔ جناب رام نائک جی کا دستِ مبارک اور شاگردانِ شارب کے خوابوں کی تعبیر منعقد کیا گیا 'جشنِ شارب' ایسا محسوس ہوا گویا لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب رقصاں ہو اٹھی، کون تھا جو اس جشن میں دلی جوش و خروش کے ساتھ شامل ہونے کو تیار نہ ہو۔ جس نے بھی سنا آرگنائزنگ کمیٹی سے یہی کہا ارے! 'جشنِ شارب' ہم ضرور آئیں گے۔ ۲؍دسمبر کے دن لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں سارا لکھنؤ 'جشنِ شارب' کے لیے اُمڈ پڑا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایس پی سنگھ صاحب اس جشن کے لیے ہر ممکن مدد کے ساتھ صدق دل سے پہلے ہی تیار تھے۔ شہر نگاراں کی اہم ادبی و سماجی شخصیتوں کی آمد نے 'جشنِ شارب' کی محفلوں کا حسن دوبالا کر دیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر پروفیسر روپ ریکھا ورما، پروفیسر رمیش دیکشت، سرویندر وکرم بہادر ڈائریکٹر ایجوکیشن ڈاکٹر عمار رضوی، وندنا مشرا، میرا ترپاٹھی، پروفیسر صابرہ حبیب، پروفیسر جمال نصرت، پرتل جوشی (AIR) طارق قمر (ETV URDU) پروین چندر شرما سابق (آئی۔ اے۔ ایس) ڈاکٹر دیپک شرما، پروفیسر آصفہ زمانی (چیئرمین یوپی اردو اکادمی)، پروفیسر مرزا خلیل بیگ، ولایت جعفری، پروفیسر مجاور حسین رضوی، پروفیسر فضل امام، پروفیسر ماہ رخ مرزا (وائس چانسلر خواجہ معین الدین عربی فارسی یونیورسٹی)، انیس انصاری، خواجہ محمد یونس، ڈاکٹر دردانہ، سلام صدیقی، عائشہ صدیقی، ڈاکٹر صبیحہ انور، سیّد سعید مہدی، پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر رخسانہ لاری، ڈاکٹر پروین شجاعت، پروفیسر عباس رضا نیر

ڈاکٹر ریشماں پروین

صدر شعبۂ اردو

کھن کھن جی گرلس پی جی کالج، لکھنؤ

رابطہ: 7565086830

اور لکھنؤ / اودھ کی خوبصورت شام غرض ایسا لگا گذشتہ تہذیب زندہ ہواٹھی:

کل بھی دامن میں تھے اسکے عقل ودانش کے چراغ
علم وفن کی پاسباں شام اودھ ہے آج بھی
مہماں کل بھی ہوئے تھے میر جیسے باکمال
اہلِ فن کی میزباں شامِ اودھ ہے آج بھی
خون کا رشتہ ہے شیخ وبرہمن کے درمیان
ایسی بزمِ دوستاں شامِ اودھ ہے آج بھی

اور اس طرح 'جشن شارب' کا آغاز ۲؍دسمبر ۲۰۱۸ء کو ۳؍بجے لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں ہوا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں عزتِ مآب گورنر رام نائک صاحب نے پروفیسر شارب ردولوی کو 'اردو تہذیب کی روشن علامت' قرار دیتے ہوئے ان الفاظ میں مبارکباد دی:

''پروفیسر شارب ردولوی اُردو تہذیب کی ایک روشن علامت ہیں، وہ موجودہ عہد میں اُردو ادب کی ایک معتبر دستخط ہیں۔ ان کی زندگی میں اتنے شان دار اور باوقار جشن کا اہتمام یقیناً لائقِ تحسین عمل ہے، اس جشن سے انھیں سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔'' (اودھ نامہ)

گورنر رام نائک صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کو اپنے ایک ہونہار طالبِ علم کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے تہہِ دل سے مبارک باد، کیوں کہ

''یہ بڑی بات ہے کہ ایک شخص جہاں سے پڑھ کے نکلا ہو وہیں اس کی خدمات کا اعتراف اس کی موجودگی میں کیا جائے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں شارب ردولوی کو ان کے تمام خدمات کی مبارک باد دیتا ہوں اور یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ وہ صرف ایک بہت بڑے نقاد یا ادیب نہیں ہیں بلکہ انھوں نے یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا اور ایک ایسا اسکول بھی قائم کیا جہاں غریب بچیوں کو کم سے کم فیس میں اچھی سے اچھی تعلیم کی سہولیت میسر ہیں۔'' (اودھ نامہ ودیگر اخبارات)

گورنر صاحب کا شارب ردولوی کے متعلق بیان ہماری اس بات کی تصدیق ہے کہ رام نائک صاحب خود ایک تاریخی شخصیت ہیں ان کی کتاب ''چریویتی چریویتی'' کے مطالعے سے ان کی زندگی کے نشیب وفراز زبردست جہد وعمل کا اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے ایک متوسط طبقے کا انسان اپنی محنت وعمل سے گورنر کے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ ''چریویتی چریویتی'' میں لکھتے ہیں:

''میں ۸۲؍کی عمر میں بھی مصروف ہوں، وجہ جانتا ہوں یہی چریویتی! چریویتی!! مسلسل چلتے جانا ہے، آگے بڑھتے رہنا ہے، ہمیشہ کام کرتے رہنا ہی میری زندگی کا مقصد ہے جب تک ممکن ہوگا میں ایسا ہی کروں گا..... میری زندگی تو مسلسل بدلتی رہی ہے، میں متوسط طبقے کا نوکری پیشہ آدمی تھا، پھر بھی سب کچھ چھوڑ کر سیاست میں آیا۔ ۲۱؍سال پہلے کینسر نے میری زندگی کی گاڑی کو روکنے کی ناکام کوشش کی، میں نے اسے بھی شکست دی اور آگے بڑھتا گیا۔''

گورنر صاحب نے جس طرح اپنی ذاتی زندگی میں مسلسل چلتے رہنے کے عزم پر خود کو قائم رکھا وہ قابلِ رشک ہے، ایک گوہر نایاب ہی دوسرے سچّے گوہر کی شناخت کرسکتا ہے، پھر بھلا کیسے ممکن تھا کہ ہمارے عزتمآب گورنر پروفیسر شارب ردولوی کی شخصیت اور ادبی وسماجی خدمات کا اعتراف نہ کرتے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے جس طرح اپنی ساری زندگی اُردو زبان وادب کے لیے وقف کردی اس سے ہم سبھی واقف ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد آج تک یہ جذبہ کم نہیں ہوا، شعاع فاطمہ اسکول کے ذریعہ انھوں نے نئی نسل کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور خود مسلسل تنقیدی وتحریری کام سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنے قلم کو اپنے عزیز شاگردوں کے سپرد کردیا۔ شارب ردولوی کی نئی کتاب 'ترقی پسند شعری فکر اور اُردو شعراء ۲۰۱۸ء' میں ان کا انتساب ملاحظہ کیجیے:

''اپنے شاگردوں کے نام
جو مجھے اولاد کی طرح عزیز ہیں
یہ قلم
جو مجھے

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک جی 'جشن شارب' کے شرکا کو خطاب کرتے ہوئے

میرے جدوآباء کی وراثت میں ملا تھا
یہ تمہیں سونپ رہا ہوں
یہ امانت ہے نئی نسلوں کی
اس میں ہر رنگ ہے، ہر طرح کی خوشبو ہے بسی
اس میں ان خوابوں کی تعبیر بھی ہے
جو کبھی دیکھے تھے ان نسلوں نے
اس میں وہ خواب بھی ہیں، میں نے جنھیں دیکھا تھا
امن کے، خوشیوں کے اور عشق کی
سرشاری کے
یہ امانت ہے نئی نسلوں کی
اس کی خوشبو کو اسی طرح سے باقی رکھنا
دیکھنا رنگ کوئی اس کا نہ اڑنے پائے
اس کی خوشبو سے مہکتے رہیں سب کوہ و دمن
اور یہ لفظوں کے چمن
یہ قلم

(شارب ردولوی) ۱۰/اپریل ۲۰۱۸ء

شارب ردولوی صرف ایک استاد ہی نہیں ہیں بلکہ اس ماں کی طرح ہیں جسے اپنے بچوں کی تعلیم کی ساتھ ساتھ اس کے سنہرے مستقبل کی فکر ہمیشہ ستاتی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کے شاگرد ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، یہ بالکل سچ ہے کہ صرف تعلیم ہی ہمیں اچھا انسان نہیں بنا سکتی اس کے ساتھ اعلیٰ تہذیبی اقدار اور بہتر تربیت ہمیں ہر اعتبار سے کامیاب و کامران کرتی ہے، تعلیم کے ساتھ ان اعلیٰ قدروں کے سفیر ہیں شارب ردولوی اپنی انھیں صفات کے سبب وہ طلباء کے دلوں میں بستے ہیں۔ پھر کیسے ان کے شاگرد جشنِ شارب' کے انعقاد کے لیے کوشاں نہ ہوتے، ایسے استاذ کے لیے تو بس یہی کہا جاسکتا ہے۔

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

شارب ردولوی نے یقیناً دلوں کو فتح کیا جس کا ثبوت جشنِ شارب' کی مقبولیت کی صورت میں سامنے آیا۔ جشن کی صدارت کرتے ہوئے جسٹس سیّد شبیہ الحسنین نے کہا:

پروفیسر شارب ردولوی خطاب کرتے ہوئے اور اسٹیج پر معزز شخصیات کی موجودگی کا ایک منظر

''پروفیسر شارب ردولوی نے اُردو تنقید میں جتنا کام کیا ہے اگر وہ مغرب میں ہوتے تو ان کا شمار ایلیٹ جیسے نقّادان کے ساتھ کیا جاتا، لیکن یہ اُردو کی زبوں حالی اور بدنصیبی ہے کہ پروفیسر شارب ردولوی کے قد کو صحیح طور سے پہچانا نہیں گیا۔ میں اگر یہ کہوں کہ وہ موجودہ عہد میں ترقی پسند تنقید کی آخری 'روشن شمع' ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

انھوں نے شارب ردولوی کا ایک شعر:

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک جی پروفیسر محمد ظفر الدین، جناب خان احمد فاروق،
پروفیسر عباس رضا نیر اور ڈاکٹر ریشماں پروین (بائیں سے دائیں) کو سند توصیف تفویض کرتے ہوئے، جناب ایس پی سنگھ (وائس چانسلر ایل یو) کی موجودگی میں

جبیں اور شوق اس کے آستاں کا
ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا

پڑھتے ہوئے کہا کہ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ شارب ردولوی نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا تھا لیکن بعد میں وہ شاعری ترک کر کے تنقید کی طرف مڑ گئے لیکن انھوں نے شاعری ترک کر کے شاعری کے ساتھ اُردو تنقید کی ایسی روشن شمع ہیں جس کی روشنی نے اپنے چاروں طرف بہت ساری شمعیں روشن کر دی ہیں۔ اس شمع کی 'لو' نے اپنے شاگردوں اور 'شعاع فاطمہ' اسکول کے طلباء طالبات کی شکل میں اقبال کی 'شعاعِ امید' کی طرح بہت ساری شمعوں کو دنیائے ادب، دنیائے علم میں روشن کیا ہے، ہاں ایک شکایت کہ شاعری ترک کے باوجود نہایت سادگی پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ ایک ادیب ہیں، نقّاد ہیں، شاعر ہیں اور غریب بچیوں کے لیے معیاری اسکول بھی چلاتے ہیں، ایک بہت نیک اور ہمدرد انسان بھی ہیں۔ اتنی خصوصیات شارب ردولوی جیسی شخصیت میں ہی جمع ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص ایک

(اوپر دائیں سے بائیں) ڈاکٹر نہال رضا، جناب عمار رضوی، جناب محمد سمیع (دہلی) جناب عارف محمود (درمیان میں) پروفیسر مظفر شہ میری، وائس چانسلر عبدالحق یونیورسٹی، کرنول،
(نیچے دائیں سے بائیں) جناب رمیش دیکشت، جناب ابراہیم علوی، جناب انیس انصاری، سابق وائس چانسلر خواجہ معین الدین اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ، جناب ولایت جعفری

انصاف نہیں کیا۔ جسٹس شبیہ الحسنین نے مزید کہا کہ اگر آج بھی آپ شارب صاحب کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ جائیں تو کچھ نہ کچھ سیکھ لیں۔'' (اودھ نامہ رد یگر اخبارات)

جسٹس شبیہ الحسنین صاحب نے اپنی تقریر میں پروفیسر شارب ردولوی کو اُردو تنقید میں ان کے صحیح مقام نہ ملنے کی بات کہی اور انھیں ترقی پسند تنقید کی آخری 'روشن شمع' کہا، کیسی خوبصورت بات ہے شارب ردولوی کردی بالکل بجا ہے۔ مگر اس نکتہ سے انکار ممکن نہیں کہ شارب صاحب کی صحبت ہر کسی کو فیضیاب کرتی ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس۔ پی۔ سنگھ نے شارب ردولوی کی انسان دوستی، شخصیت کی سادگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درج ذیل الفاظ میں ان کی خدمات کو سراہا:

''شارب ردولوی ایک بڑے آدمی ہونے عہدے پر ہو تو اس کی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور اس کا جشن منایا جائے لیکن جب وہ عہدے پر نہ ہو پھر بھی اس کے لیے ایسے جلسوں کا اہتمام کیا جائے تو اس کی شخصیت کی عظمت کے پہلو از خود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔'' (اودھ نامہ رد یگر اخبارات)

فلمی نغمہ نگار اور صحافی حسنِ کمال نے پروفیسر شارب ردولوی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا:

ڈاکٹر شمس الہدیٰ، پروفیسر سراج اجملی (علیگ)، پروفیسر فضل امام رضوی پروفیسر محمد کاظم اور جناب ابوالحسنات اظہار خیال فرماتے ہوئے

''میں اسی لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم رہا ہوں اور آج جس مقام پر بھی ہوں اس میں شارب ردولوی کا بڑا ہاتھ ہے حسن کمال نے یونیورسٹی میں ہونے والے ایک طرحی مشاعرے کے حوالے سے کہا کہ شارب ردولوی نے میرے ایک شعر پر کہا تھا کہ اب تم شاعر ہو گئے تبھی سے میں نے شاعری کو سنجیدگی کے ساتھ لینا شروع کر دیا۔'' (بیشتر ہندی وار دو اخبارات)

جرمنی سے تشریف لائے شارب ردولوی کے عزیز دوست عارف نقوی صاحب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں اسی زمانے میں طالب علم تھے اور آج بھی دونوں کی دوستی ایک مثال ہے کے مطابق لکھنؤ یونیورسٹی میں کوئی ادبی سرگرمی شارب صاحب کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی، انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ جلد ہی ''اردو انجمن برلن'' کی جانب سے شارب ردولوی کو ''اردو ادب کا روشن ستارہ'' ایوارڈ دیا جائے گا۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے تقریب کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ جس نے بھی اُردو میں ایم۔ اے کیا ہے وہ شارب صاحب کا معنوی شاگرد ہے کیوں کہ ان کی کتاب جدید اُردو تنقید اصول و نظریات پڑھے بغیر ایم۔اے کی ڈگری نہیں لی جا سکتی۔

سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے تشریف لائے شارب ردولوی کے عزیز شاگرد پروفیسر ظفر الدین نے اپنے مضمون ''جشنِ شارب کیوں؟'' کے عنوان سے جشنِ شارب کے محرکات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کے مقصد کا بیان کیا انھوں نے کہا:

''جشنِ شارب کا انعقاد استاد محترم کی خدمات کا اعتراف کرنا ہے، انھوں نے کہا کہ ہم لوگ تو باقاعدہ ان کے شاگرد ہیں لیکن شارب سر کا کمال یہ ہے کہ وہ جس ادارے میں رہے یا جس محلہ میں رہے وہاں کے لوگ بھی ان کے شاگرد اس معنی میں ہو گئے کہ ان لوگوں نے شارب سر سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔''

واضح رہے کہ پروفیسر ظفر الدین 'جشنِ شارب' کی آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر بھی ہیں ایک خاص نکتہ جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا کہ شارب ردولوی جہاں رہے وہاں کے لوگ کسی نہ کسی معنی میں ان کے شاگرد ہو گئے ہر ایک نے ادبی و سماجی سطح پر شارب ردولوی سے کسبِ فیض کیا۔ 'جشنِ شارب' کے انعقاد میں دل و جان لگا دینے والے اودھ نامہ اخبار کے پروپرائٹر وقار رضوی نے 'جشنِ شارب' کے سلسلے میں لکھا:

''جشنِ شارب کے دعوت نامہ میں شاگردانِ شارب کے ساتھ ہمارا نام لکھا جانا ہمیں وہ سربلندی عطا کرتا ہے جو شاید کم ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہمیں ان کا کلاس روم شاگرد ہونے کا حق تو حاصل نہیں ہوا لیکن آج جو کچھ بھی اُردو ادب، اُردو دنیا، اور زندگی کے تمام اُتار چڑھاؤ کے بارے میں جانتے ہیں یہ ان ہی کی سرپرستی کا نتیجہ ہے 'جشنِ شارب' کا یہ جلسہ اصل میں شاگردانِ شارب کا ہی خواب ہے جو انھوں نے گذشتہ سال پروفیسر شمیم نکہت کے دو روزہ سیمینار میں دیکھا اور آج اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔''

پروفیسر شارب ردولوی کے حوالے سے منعقد کئے جانے والے ''جشنِ شارب'' کے بارے میں اُن کے عزیز شاگرد ڈاکٹر خان فاروق کا اظہار خیال ملاحظہ ہو:

''۱۸ر ستمبر ۲۰۱۷ء..... کیفی اکادمی لکھنؤ ..... ہماری میڈم پروفیسر شمیم نکہت پر ایک مہتم بالشان سیمینار کا دوسرا دن .....سیمنار کا اختتام ..... آج تقریباً سب موجود ہیں .....غم زدہ، اس لیے کہ سب تھے صرف میڈم نہیں تھیں۔ وہ ہوتیں تو یہ خوشی دوبالا ہوتی۔ یہ بات سب کے ذہنوں میں ہوگی میرے منھ سے نکل گئی..... میں اور امتیاز تھوڑی دور سب سے الگ۔ امتیاز نے اپنے انداز میں کہا..... ہاں یار..... فاروق بہت اچھا لگتا.....میڈم کے سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر پائے..... ہمیں شارب صاحب کی زندگی میں ہی ان پر کوئی جلسہ کرنا چاہیے دونوں کے منھ سے نکلا.....لیکن سر منع کر دیں گے..... کرنے ہی نہیں دیں گے جلسہ۔ اس خوف نے بھی سر اٹھایا اور اگر سر نے منع کر دیا پھر کس کی ہمت..... ایک دس قدم پر وقار بھائی۔ ہم ان کو گھسیٹتے ہوئے الگ لائے اور اپنا بوجھ ان پر ڈال دیا.....بس طے ہو گیا کہ سر کو نہیں بتانا ہے اور آپ لوگ مضامین لکھوایئے میں تیاریاں شروع کرتا ہوں..... پھر ہم ظفر بھائی (پروفیسر محمد ظفر الدین) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اب تک کے خفیہ پروگرام سے واقف کرایا وہ چہک اٹھے..... ضرور کرو۔ میں ہر طرح

دائیں سے بائیں، پروفیسر رضی الرحمن، پروفیسر مرزا ماہر رخ، وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ، پروفیسر سید مجاور حسین، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق خطاب کرتے ہوئے

تمہارے ساتھ ہوں۔ جی نہیں ساتھ نہیں..... سرپرستی فرمایئے..... اپنا سارا بوجھ ظفر بھائی پر ڈال کر ڈاکٹر ریشماں پروین اور ڈاکٹر محمد کاظم کو اس خفیہ مشن سے آگاہ کرایا۔ ان کے چہرے بھی خوشی سے دمکنے لگے..... ہوٹل تک آتے آتے یہ خفیہ مشن صرف اتنا خفیہ رہا کہ شارب صاحب کے علاوہ سب کو خبر ہو چکی تھی۔ عطیہ، کہکشاں، اور عرشیہ جبیں سے بہت دیر تک تیاریوں کے متعلق بحث ہوتی رہی..... فون نمبر اور ای-میل نوٹ کیے جاتے رہے۔ اور ہم سب لکھنؤ سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر واپس اپنے اپنے ٹھکانوں کو آ گئے اور پھر اِسی طرح اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پلان بنتے رہے۔ ترمیم ہوتی رہی۔ ظفر بھائی نے ضرور جشنِ شارب کو حیدرآباد میں کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر کاظم اور امتیاز نے دہلی میں جلسہ کی تجویز رکھی..... پھر سب مصروف ہو جاتے..... ایک سناٹا..... چھا جاتا۔ وقار صاحب ضرور مہمیز کرتے رہتے۔ ہم سب بھی بکھرے تھے۔ آخر فروری کی چھبیس تاریخ کو یہ موقع آیا کہ کاظم، امتیاز اور میں دہلی یونیورسٹی میں امتیاز کے کمرے میں جم کر بیٹھ گئے کہ آج تمام معاملات طے کر کے ہی اٹھیں گے۔ شارب صاحب کے قریبی دوستوں اور شاگردوں کی فہرست بنائی گئی۔ ان سے رابطہ کیا جانے لگا اور وہ فہرست ریشماں اور وقار رضوی کے ملاحظے، حذف و اضافہ کے لیے میل کر دی گئی..... پروفیسر شمیم نکہت دوسرے یادگاری خطبہ کی تاریخ بھی نزدیک آ گئی اور ایک بار پھر لکھنؤ میں اکٹھا ہو کر جشنِ شارب کا خاکہ بنانے کی بات ہونے لگی۔ گیارہ مارچ دو ہزار اٹھارہ کا دن بھی آ گیا اور سب لکھنؤ میں جمع ہیں۔ کاظم اور امتیاز نہیں آ سکے۔ ریشماں اور وقار رضوی صاحب مایوس اور ہم شرمندہ۔ ایک بار پھر سرا پکڑا گیا اور تیرہ مئی دو ہزار اٹھارہ کا دن طے ہو گیا۔ ظفر بھائی ہر حال میں تیار۔ کام تو شروع کرو۔ لوگوں سے رابطہ کرو۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ شارب صاحب کو خبر نہ ہو۔ میں نے اقبال مجید صاحب سے رابطہ کیا۔ بہت زور زور سے بول کر ان کو ساری بات بتائی اور شارب صاحب کو قطعی خبر نہ ہو اس بات کی کئی بار گزارش کی۔ ریشماں نے عارف نقوی صاحب سے جرمنی میں رابطہ کیا۔ اور اس درمیان اقبال مجید صاحب کا مضمون بھی آ گیا اور شارب صاحب کا فون بھی..... فون ریشماں کے نمبر سے تھا اس لیے اطمینان سے ہیلو کہا..... ادھر سے بلا تمہید ریشماں نے کہا..... لو فاروق بابا سے بات کرلو..... جی سر السلام علیکم..... دوسری طرف سے ایک ٹھنڈی آواز..... یہ کیا کر رہے ہو..... تم لوگ..... کچھ نہیں سر..... کیا ہوا..... نہیں یہ غلط بات ہے بالکل غیر مناسب..... معلوم ہوا وقار صاحب اور ریشماں وہاں سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ امتیاز، کاظم ڈانٹ کھا چکے ہیں..... اب میری باری ہے، اقبال مجید صاحب سے اتنی زور زور سے چیخ چیخ کر کہنے کے باوجود انھوں نے سب باتیں سنیں اور جو بات تاکید کے ساتھ خاص طور پر کہی گئی وہی نہیں سنی، انھوں نے سیمنار میں حاضر نہ ہو پانے کے لیے معذرتی فون کیا۔ ادھر عارف نقوی صاحب نے مئی کی گرمیوں میں نہ آ پانے اور سیمینار کی تاریخ بڑھانے کے لئے شارب صاحب سے بات کی۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ خفیہ پروگرام شارب صاحب سے مخفی نہ رہ سکا۔ شارب صاحب اچنبھے میں حیران! پریشان..... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ فون کیوں آنے لگے۔ ہماری پیشی ہونی تھی..... ہوئی..... ان کے مسلسل انکار، تاکید اور تنبیہ کے باوجود ہم مسکوٹ کرتے رہے جب ان کو لگا اب یہ سب حکم عدولی پر آمادہ ہیں تو ایک بوڑھے باپ کی طرح خاموش اور چپ بیٹھ رہے..... باپ ہی تو ہیں وہ ہم سب کے..... اور پھر تاریخ بڑھی، پھر مصروفیت..... وقفہ..... خاموشی..... سنّاٹا..... وقار صاحب کی جھنجھلاہٹ، ریشماں کی فکر میں ڈوبی آواز..... ظفر بھائی کی بار بار تاکید..... وقار صاحب نے جشنِ شارب کے معاملات کو اور وسعت دی، شارب صاحب کی مادرِ علمی لکھنؤ یونیورسٹی..... اس کا اُردو شعبہ..... پروفیسر عباس رضانیر..... ایک اور جان نچھاور کرنے والے شاگرد..... عبدالسمیع..... سب کو شامل کر لیا..... گورنر جناب رام نائک جی کی رضامندی مل گئی۔ دو، تین اور چار دسمبر ۲۰۱۸ء کو ہم سب لکھنؤ میں جمع ہو رہے ہیں..... کاظم، امتیاز دہلی سے اپنی موٹر کار اڑاتے ہوئے لکھنو پہنچے۔۔۔ ہم بھی آ دھمکے۔۔۔ نہاری، کلیجے، کھیر،

جناب پی سی شرما (سابق آئی اے ایس)، ڈاکٹر عمیر منظر، جناب عارف نقوی (برلن)، پروفیسر خلیل احمد بیگ (علیگ) اور جناب حسن کمال خطاب کرتے ہوئے

گاجر کا حلوا، ٹنڈے کباب، وقار صاحب کا گھر اور بھابی کے ہاتھ کا بنایا پر تکلف کھانا۔۔۔ ریشماں۔۔۔کاظم، امتیاز اور میں۔۔۔جشن شارب کا خاکہ۔۔۔ترمیم، اضافہ۔۔۔صرف کام کی باتیں۔۔۔۔۔ شارب صاحب خاموش..... ایک چپ.....ہزار چپ.....ان بے ہودوں سے بولیں بھی تو کیا بولیں، نافرمانی کی حدیں پار کر رہے ہیں۔

دو دسمبر دو ہزار اٹھارہ..... سہ پہر..... تین بج رہا ہے.....لکھنؤ یونیورسٹی کا مالویہ ہال..... جرمنی سے عارف نقوی (شارب صاحب کے عزیز دوست) اُردو کے ہندوستان بھر سے درخشاں ستارے جمع ہیں۔ مالویہ ہال میں ایک کہکشاں روشن ہے۔ اس کا ایک ستارہ مہتاب بن کر ہزاروں ستاروں کو روشن کر رہا ہے۔ آج کا دن تاریخ رقم کرنے والا ہے، اس کی شہادت کے لیے لکھنؤ کے آفتاب و مہتاب تشریف لا رہے ہیں۔ ہم سب کو شارب صاحب کا انتظار ہے وہ آتے ہیں۔ ہم سب کے چہرے مسرت اور شادمانی سے لال ہیں.....شارب صاحب کی آنکھیں۔ ہم ان کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ہماری نظریں ان کے قدموں پر ہیں.....سر بہت معذرت، ہم نے آپ کی بات نہیں مانی.....مگر آپ نے ہماری بات مان لی۔ سر! آپ کی یہی محبتیں تو ہم کو یہاں تک لائی ہیں۔ سر! آپ ہم سب سے پوچھ رہے تھے کہ آپ پر جلسہ کیوں ہونا چاہیے.....ان تین دنوں میں پوری اردو دنیا یہی ثابت کرے گی کہ آپ پر پروفیسر شارب ردولوی پر جلسہ کیوں ضروری ہونا چاہیے۔''

شارب صاحب کے شاگرد ڈاکٹر محمد کاظم نے 'جشنِ شارب' کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا

''ہم خود کو خوش نصیب اس لیے سمجھتے ہیں کہ استاد نے ہم جنگلی درختوں کو کاٹ چھانٹ کر سنوار دیا۔ بلکہ پھل دار درخت بنا دیا۔ ایسے کم ہی اساتذہ ہوں گے جن کے شاگرد نہ صرف پوری دنیا میں کامیاب ہیں بلکہ شاگردوں کے شاگرد بھی اب پھل دار درختوں میں تبدیل ہوتے دکھائی دے رہے ہیں، پھر ایسے استاد کا جشن کیوں نہ منایا جائے۔ دراصل یہ جشن استاد کا نہیں ہم سب شاگردوں کا ہے کہ ہم سب لوگ جشنِ شارب کے بہانے استاد کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے قدموں میں بیٹھنا چاہتے ہیں، خود کو 'لوٹ پیچھے کی طرف' کے مصداق ان کی کلاس میں بیٹھنا چاہتے ہیں.....جشن اس بات کا کہ صرف شاگرد ہی نہیں استاد کے دوست اور احباب نہ صرف سارے ہندوستان بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک سے ہماری دعوت پر تشریف لا رہے ہیں۔''

جشنِ شارب کے سلسلے میں پروفیسر مظفر شہ میری وائس چانسلر (مولوی عبدالحق یونیورسٹی کرنول آندھرا پردیش) خصوصی دلچسپی لیتے رہے، آرگنائزنگ کمیٹی کی ممبر ڈاکٹر ریشماں پروین کو انھوں نے بار بار تاکید کی کہ اگر کوئی پریشانی ہو یا میرے لیے کوئی ذمہ داری ہو تو فوراً فون کرنا، اتنے بڑے ادیب اور عبدالحق یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حوصلہ افزائی نے آرگنائزنگ کمیٹی کے حوصلوں کو دوگنا کر دیا۔

نتیجہ ۲ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو ملک کے کونے کونے سے تقریباً تمام یونیورسٹیز اور کالجز مثلاً مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، ڈاکٹر شمس الہدیٰ، سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے ڈاکٹر عرشیہ جبیں، دہلی یونیورسٹی دہلی سے ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر عطیہ بیگم، ڈاکٹر کاظم، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر ارشاد احمد، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر ندیم احمد، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے شاہد رضی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پروفیسر سراج اجملی، سینٹرل یونیورسٹی کشمیر سے ڈاکٹر پرویز احمد، گورکھپور یونیورسٹی سے پروفیسر رضی الرحمن، جموں یونیورسٹی سے ڈاکٹر ریاض احمد، کانپور یونیورسٹی سے ڈاکٹر خان احمد فاروق، مئو ناتھ بھنجن کے ڈی۔ سی۔ ایس کے کالج سے ڈاکٹر شکیل احمد، ویسٹ بنگال کلکتہ کے ہگلی محسن کالج سے ڈاکٹر عمر غزالی، امرتسر سے ڈاکٹر ریحان حسن، لکھنؤ یونیورسٹی کے کرامت کالج سے ڈاکٹر شبنم رضوی، کُھن کُھن جی گرلس پی جی کالج لکھنؤ سے ڈاکٹر ریشماں پروین، خواجہ معین الدین چشتی عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ سے ثوبان سعید، ڈاکٹر اکمل

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر ریاض احمد (کشمیر)، ڈاکٹر ارشاد نیازی، پروفیسر شارب ردولوی کو ڈاکٹر پرویز احمد (سری نگر) شال اڑھاتے ہوئے، ڈاکٹر خالد اشرف اور، ڈاکٹر عمر غزالی اظہار خیال کرتے ہوئے

شاداب۔ غرض کونسی ایسی یونیورسٹی تھی جہاں سے شاگردانِ شارب 'جشنِ شارب' میں شامل ہونے کے لیے نہیں آئے ہوں۔ رانچی یونیورسٹی میں شارب صاحب کے عزیز شاگرد ڈاکٹر حسن مثنیٰ اس وقت سخت بیمار تھے، ڈاکٹر ریشماں نے فون پر اُن سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ چاہے میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر آؤں مگر اُستاد کے جشن میں ضرور شامل ہوں گا۔ (آج مثنیٰ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی روح آج بھی اپنے استاد کے ساتھ ہے)

جشن کے دوسرے اور تیسرے دن کے جلسوں کے لیے کیفی اعظمی اکیڈمی کے جنرل سکریٹری سیّد سعید مہدی صاحب نے خصوصی تعاون کیا۔ ۳؍دسمبر اور ۴؍دسمبر ۲۰۱۸ء کے جلسے کیفی اعظمی اکیڈمی لکھنؤ میں ہوئے۔ اتر پردیش اردو اکادمی، اردو دوست انجمن کے ساتھ اس جشن کو کامیاب بنانے میں لکھنؤ کے مقامی لوگوں نے ہر ممکن مدد کی، بلکہ یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ مقامی لوگوں کی بڑی تعداد میں شرکت نے ہی اس جشن کو 'یادگار جشن' میں تبدیل کیا۔ شاگردان شارب اور مقامی لوگوں کے جوش وخروش کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ یہ جشنِ شارب نہیں بلکہ جشنِ عاشقانِ شارب یا جشنِ لکھنؤ تھا۔

اس تقریب کو کامیاب بنانے میں لکھنؤ کے تمام اسکول، کالجز، یونیورسٹیز کے طلباء وطالبات اور تمام اساتذہ شامل رہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے پروفیسر عباس رضا نیر، ان کے شعبہ کے تمام اساتذہ، مولانا آزاد یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس سے ڈاکٹر عبدالقدوس کے ساتھ ان کے تمام اساتذہ خصوصاً ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر عشرت ناہید، ڈاکٹر مجاہدالاسلام اور ڈاکٹر نور فاطمہ، خواجہ معین الدین چشتی عربی فارسی یونیورسٹی سے پروفیسر شفیق اشرفی اور تمام اساتذہ، شیعہ پی جی کالج، کھن کھن جی گرلس پی جی کالج، مہیلا کالج، ممتاز پی جی کالج، شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج سے تمام اساتذہ اور طلباء وطالبات نے شرکت کی، خصوصاً اساتذہ اور شاگردان شارب نے اس جشن میں شامل مقالہ نگاران کے ساتھ شارب ردولوی کی ادبی اور تنقیدی خدمات پر جس سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا اس سے شارب ردولوی کی شخصیت اور تنقیدی بصیرت کی بہت سی جہات سامنے آئیں۔ سارے ہندوستان سے آئے اس جمِّ غفیر کو دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے کشمیر سے کرنول تک سب عشقِ شارب میں سرشار ہیں۔

ایک اور خاص بات اس جشن کی یہ رہی کہ جشن آرگنائز ہوا تو لگا ہی نہیں کہ یہ جشنِ اردو ہے بلکہ لکھنؤ تو لکھنؤ اس کے اطراف وجوانب سے ایک بھیڑ امڑی چلی آئی۔ ردولی، بارہ بنکی، کانپور سے لوگ جوق در جوق 'جشنِ شارب' میں آئے۔ سب کے نام لینا تو یہاں ممکن نہیں مگر ردولی سے ڈاکٹر نہال رضا، ردولی کے چیئرمین جبار علی، محمود سہیل، چودھری اکبر مہدی عرف عون، رفعت عزمی، رویش کمار اگروال، ایچ این سنگھ، محمد ندیم خصوصاً ڈاکٹر نہال رضا نے یہ اعلان بھی کیا کہ شارب صاحب کے نام پر ردولی میں ایک گیٹ یا سڑک تعمیر کی جائے گی۔

کانپور سے تشریف لانے والوں میں عارف محمود صاحب کا نام محتاجِ تعارف نہیں، شارب ردولوی کے اسکول کے ساتھی دوست ان کے تمام حلقۂ احباب اور شاگردوں میں بے پناہ مقبول۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ابوالحسنات صاحب اور دوسرے کئی مقامی لوگوں نے 'جشنِ شارب' کی رونق بڑھائی۔ بارہ بنکی سے ڈاکٹر ایس ایم حیدر صاحب اور دوسرے بہت سے لوگ تشریف لائے۔ ہندوستان کی مشہور ومعروف سنگر مالویکا ہری اوم نے شارب ردولوی کی غزلوں کو اپنی خوبصورت آواز میں گا کر سامعین کو محصور کر دیا۔

جشنِ شارب کے انعقاد کے سلسلے میں بعض مخلصین ایسے بھی تھے جنھوں نے پردے کے پیچھے رہ کر اور اپنا نام نہ ظاہر کرتے ہوئے آرگنائزنگ کمیٹی کے ساتھ ہر لمحہ تعاون کیا۔ ان میں شارب ردولوی کے دونوں بھانجے، عاصم رضا، شبیب حسنین، ان کی لاڈلی پوتی باریہ زہرا، جنھیں ہر لمحہ شارب صاحب کی ناراضگی کا خوف ستاتا رہا (کہ شارب صاحب اس جشن کے لیے کسی صورت راضی نہ تھے) مگر اس کے باوجود یہ تینوں 'جشنِ شارب' کی کامیابی کے لیے کوشاں رہے اور چپکے چپکے بڑی خاموشی سے راقم الحروف سے ملتے رہے اور اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ 'باریہ زہرا'

(دائیں سے بائیں) محترمہ مالویکا، ڈاکٹر صبیحہ انور (درمیان میں) پروفیسر شارب ردولوی اپنی پوتی میڈیکو باریہ زہرا کے ساتھ یادگار لمحہ، پروفیسر آصفہ زمانی، محترمہ سلمیٰ حجاب خطاب کرتی ہوئیں

کی خوشی کا عالم جشن کے دن دیکھنے والا تھا، وہ ایراز یونیورسٹی لکھنؤ سے اپنے MBBS گروپ کے ساتھ جشن میں موجود تھیں۔

بغیر کسی نمود ونمائش کے 'جشنِ شارب' کے انعقاد میں حصّہ لینے والی تقدیس فاطمہ (ایڈیٹر اودھ نامہ) بھی ایسی ہی خاموش کارکن ہیں، جشن کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کے دوران ان کی خوبصورت مسکراہٹ، پرسکون چہرہ ہم سب کی جھنجھلاہٹ اور غصّہ کو دور کر دیتا۔ اور ہم سب پھر سے تروتازہ ہوکر جشن کی تیاریوں میں لگ جاتے۔

باہر سے آنے والے تمام مہمانان کے لیے ہوٹل ردیٰ کے مالک شارب صاحب کے عزیز دوست حفیظ نعمانی اور ان کے بیٹے ذوالنون کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں کہ انھوں نے پورا ہوٹل مہمانان کے لیے ریزرو کر دیا۔

اس جشن کو کامیاب بنانے میں شعاع فاطمہ انٹر کالج کی پرنسپل میرا ترپاٹھی، موسیٰ رضا، شفقت قمر اور پورا اسٹاف دن رات لگا رہا، خصوصاً رام نریش یادو جنھوں نے دفتری کاموں کے علاوہ دیگر تمام ضروریات کے لیے خود کو جیسے وقف کر دیا۔ انھوں نے کبھی یہ کہا ہی نہیں کہ فلاں کام میرے بس کا نہیں۔

'جشنِ شارب' کئی اعتبار سے تاریخی رہا۔ سب سے اہم بات یہ کہ دنیائے ادب میں کسی کے شاگردوں نے اپنے استاد کے لیے سارے ہندوستان سے جمع ہوکر اتنا بڑا جشن نہیں منایا ہوگا۔ جشن میں شامل دانشوروں، ناقدین اور مختلف یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز سب نے یک زبان یہی کہا کہ ''دنیائے ادب میں سہ روزہ جشنِ شارب ایک بے مثال تقریب ہے'' اس بات کو مزید سند ہمارے عزتِ مآب گورنر رام نائک جی نے جشن کے تیسرے دن عطا کر دی۔ جناب رام نائک جی نے شارب صاحب کے اعزاز میں راج بھون میں 'جشنِ شارب' کے منتظمین اور شرکاء کی شان دار دعوت کا اہتمام کر کے خود ہم آرگنائزرز کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اب اگر ہم خود بھی چاہیں تو ایسا جشن دوبارہ نہیں کر سکتے۔ راج بھون کی یہ دعوت ایک عام دعوت نہیں تھی خود گورنر صاحب اور ان کی اہلیہ کُندا نائک بطورِ میزبان پورا وقت ہم لوگوں کے ساتھ رہے۔ اس طرح یہ جشن اور اس کا اختتام شاگردانِ شارب، تمام شرکاء اور آرگنائزرز کے لیے ایک خوبصورت حسین یاد بن گیا۔ جس کا نقش صرف دلوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے، الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

❑❑❑

'جشنِ شارب' کی متکلمات بالترتیب ڈاکٹر پروین شجاعت، ڈاکٹر عشرت ناہید، ڈاکٹر کہکشاں، ڈاکٹر شبنم رضوی، ڈاکٹر عرشیہ جبیں (حیدرآباد) اور پروفیسر صابرہ حبیب

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک جی کی طرف سے گورنر ہاؤس میں 'جشنِ شارب' کے بعد دی جانے والی عشائیہ تقریب کا ایک یادگار گروپ فوٹو

’کوئی میرے دل سے پوچھے‘ ڈاکٹر نیازؔ سلطانپوری کا شعری مجموعہ، عاصم بھائی (ایڈیٹر نیادور لکھنو) نے مرحمت فرمایا۔ کتاب کی خوش رنگ تزئین کاری نے سب سے پہلے متاثر کیا اور قرأت کے بعد دل بھی غزلوں کے تغزلانہ مزاج اور نظم کے بیانِ اعجاز میں محو ہوگیا۔ اس مجموعے کے منظوم حصہ میں نعت پاک اور دعا کے بعد ڈاکٹر نیاز کی گیارہ نظمیں، تینتالیس غزلیں، دوہے اور رباعیات شامل ہیں، نثری حصہ میں ’مشاہیر کی نظر میں‘ عنوان کے تحت ادیب وداںشوران کی آراء موجود ہے، جس سے ڈاکٹر نیازی کے فن پر روشنی پڑتی ہے اور اختتامیہ مصنف کے ایک اور شعری مجموعے ’آفتاب تازہ‘ پر اشفاق محمد خاں کے ذریعہ کئے ہوئے تبصرہ پر ہوا ہے۔

حال میں شعری مجموعے خاصی تعداد میں شائع ہوئے لیکن ان میں کم ہی ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنی شاعری کے اعجاز کے ذریعہ قاری کے ذہن پر اثر ڈالا ہو کیونکہ فقط ردیف و قافیے کی بہترین ترتیب کسی شاعری کو زندہ رکھنے کیلئے کافی نہیں بلکہ اشعار کے بین السطور پنہاں ایک معنیاتی دنیا آباد ہوتی ہے جو زمانے کے امداد کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ یہ معنیاتی دنیا ہر زمانے کے قاری کو شاعری سے مانوس بنالیتی ہے۔ شعر کسی زمانے کا ہو قاری اسے اپنی زندگی کے منظر نامے پر ابھار کر دیکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نیازی

اک ایک حرف شعر کا گر بولتا نہ ہو
دنیائے شاعری میں کوئی معجزہ نہ ہو

ڈاکٹر نیازی کی کئی غزلیں اور نظمیں ان کی بیان کی ہوئی اس صفت سے متصف ہیں۔

اس مجموعے میں شامل کئی غزلیں زمانے کی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ زمانے کے بنیادی مسائل، روزمرہ کی شکایتیں، فرد واحد سے لیکر اجتماعی زندگی کی پریشانی حتی کہ عالمی حادثات کو اپنی مختصر غزلوں میں پیش کر کے ڈاکٹر نیازی نے غم دوراں کو پیش کیا ہے۔ انکے یہ اشعار کس طرح تلخ حقیقت کو بیان کررہے ہیں ؎

دین و ایماں سے غرض ہے نہ روایات کا پاس
تیل کی کھوج میں یورپ کے صنم آتے ہیں

ہندو ہی لگے ہے نہ مسلمان لگے ہے
کچھ اور ہی اس دور کا انسان لگے ہے

ڈاکٹر نیازی کلاسیکی شاعری کے امین ہیں ان کی غزلوں میں معشوق اپنی پوری عشوہ طرازیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے، زیر نظر مجموعے میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں جن میں قدیم موضوعات کو نئے ڈھنگ سے باندھا گیا ہے۔ جدید غازہ کاری نے پرانی تشبیہات کو نیا شباب عطا کیا ہے۔ بندش الفاظ کی احتیاط نے ایک نغمگی پیدا کی ہے، تلمیحات کا اشارہ تاریخی واقعوں اور قصوں کو تر و تازہ کر دیتا ہے۔

مانا کہ ان کو اپنی مسیحائی پہ ناز ہے
بیمار عشق ہوں مجھے اچھا کرے کوئی

کتاب میں شامل نظمیں بھی زمانوں کے تجربات، داخلی احساسات اور مذہبی احترامات سے لبریز ہیں، نظم پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے غزل کی تنگی دامن کے مدنظر اپنے خیالات کو نظم کی کشادہ راہوں پر آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان کی چھوٹی نظم جس کا عنوان ’نظم‘ ہے تلخ حقائق سے معمور ہے۔ یہ آزاد نظم انسانی سرشت کی ابتری کو ظاہر کر رہی ہے۔ انصاف کی معدومی نے زندگی کو کتنا پست کر دیا ہے اس نظم کا مرکزی نقطہ نگاہ ہے۔ شاعر نے اس نظم میں حیائے مریمؑ، قبائے باتوؑ اور ردائے زینبؑ کا ذکر بطور استعارہ کیا ہے۔ اسی طرح دیگر نظمیں بھی ایک مستقل موضوع پر ہیں مثلاً ’اے مری اردو زباں‘، اے مرے مرد فلسطین‘ اور کتاب کی سب سے پہلی نظم ’عظمت ہند‘ جو نظموں میں سب سے طویل ہے۔ اس نظم میں ہندوستان کی ثقافت و تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاعر کی خلاقانہ فطرت نے قومی یکجہتی اور حب وطنی کے آثار کو بڑی خوبصورتی سے نظم میں ابھارا ہے۔ کبیر و نانک، رحیم و امیر، کرشن و گوتم اور اکبر اعظم کے ذکر کے بعد موجودہ صورت کا نقشہ بھی موثر انداز سے کھینچا ہے۔

عجیب طرح کے فتنے جگائے جاتے ہیں
غریب ہیں کہ برابر مٹائے جاتے ہیں

ایک چھوٹی بحر میں مختصر سی نظم بعنوان ’لفظ‘ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آخری نظم ایک مبہم عنوان ’’۔۔۔کے نام‘‘ سے ہے۔ پڑھنے میں نظم سے زیادہ غزل کا اشتباہ ہوتا ہے اور شاید اسی لئے شاعر نے اس نظم کو کتاب میں غزل سے بالکل قریب رکھا ہے (اسی نظم کے بعد سے غزلوں کا آغاز ہوتا ہے)۔ مجموعے میں چھ دوہے اور چھ رباعیات بھی شامل ہیں جن پر وہی رنگ نظر آتا ہے جو غزل اور نظم پر غالب ہے۔

قدریں سب بوڑھی ہوئیں مانوتا نیلام
چور اچکوں کو کریں بڑے بڑے پرنام

مشاہیر زمانہ کی رائے میں پروفیسر قمر رئیس، شافع قدوائی، ڈاکٹر تیا گی، ڈاکٹر عبدالباری نے اپنی آراء کو درج کیا ہے۔ آخر میں ’’آفتاب تازہ‘‘ پر ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کا مختصر تبصرہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی ڈاکٹر نیازی اپنے ’بوئے خیالات‘ کو ’گل الفاظ‘ میں سموں کر گلستان شاعری کو مہکا چکے ہیں لہٰذا ’کوئی میرے دل سے پوچھے‘ بھی قارئین کے دلوں کے شاعرانہ جذبات کو ابھارے گا اور قارئین کے شاعرانہ ذوق کی تسکین کا سبب بنے گا جس کا احساس ڈاکٹر نیازی کو حصول داد و تحسین کی شکل میں ہوگا۔ وہ خود اپنے شاعری کے لئے کہتے ہیں

ارباب نظر کیوں نہ مجھے سر پہ بٹھائیں
ہر شعر میرا میرؔ کا دیوان لگے ہے

امید ہے کہ ڈاکٹر نیازؔ سلطان پوری کا یہ مجموعہ بھی اپنے پہلے شعری مجموعہ کی طرح مقبول و معروف ہوگا اور قارئین کشادہ دلی سے اس کی پذیرائی فرمائیں گے۔

❑❑❑

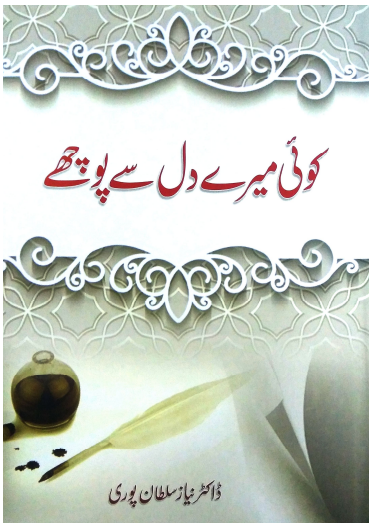

مبصر : موسیٰ رضا
قیمت : 150 روپئے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ملنے کا پتہ

سمیع پبلی کیشنز، سلطانپور اور دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

آپ کے خطوط

'نیا دور' کا اکتوبر ماہ کا شمارہ رثائی ادب اور شعرا وغیرہ پر مبنی ہے۔ اس میں نئے مدیر سید عاصم رضا صاحب نے گویا آتے ہی میدانِ اردو ادب میں، کرِکٹ کی زبان میں، ایک زبردست چھکّا مارا ہے۔

اس شمارے کے تحت عصرِ حاضر میں رثائی ادب پر مبنی پروفیسر شارب ردولوی کا مضمون از حد معلوماتی ہے۔ علی احمد فاطمی صاحب کا مضمون زیرِ عنوان 'مرثیے کی جمالیات' بھی ہمیشہ کی ہی مانند ایک بلند پایہ و مایہ ناز نقاد کی چغلی کھانے والا ثابت ہوا ہے۔ اس مضمون میں اس امر سے صدفی صد اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اصلی شاعری تو غصے سے ہی پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک انگریزی پوئیٹ کا فقرہ بھی ہے:

Poetry blossoms out of anger

لئیق رضوی صاحب کا مقالہ بھی معیاری و احسن ہے اور اپنے منتخب مضمون کے ساتھ کاملاً انصاف کرنے والا تحقیقی مضمون ہے۔ اس میں بالخصوص عوامی گیتوں سے مطالعے کا مزہ دوآتشہ ہوتا چلا گیا ہے۔

عادل فراز صاحب کا مقالہ زیرِ عنوان 'جدید مرثیہ اور مزاحمتی رویئے' بھی ایک خاص اعلیٰ و ارفع تخلیق ہے۔

کلی طور پر یہ شمارہ از حد معلوماتی و تحقیقی طلبا و انکے استادوں کے لیے از حد قابلِ استفادہ ہے اور اپنے ذاتی کتب خانے میں جلد بندھوا کر رکھنے کا درخور ثابت ہوتا ہے۔ اس خاکسار کی جانب سے صدہا تہنیت و مبارکباد قبول فرمائیں۔

کرشن بھاؤک

پٹیالہ، پنجاب

نیا دور ادبی دنیا کا مقبول ترین رسالہ ہے۔ رثائی ادب سے متعلق اکتوبر ۲۰۱۸ء کا شمارہ آپ کی محنت اور فکری بصیرت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ خصوصی گوشہ میں 'عصر حاضر میں رثائی ادب' قابل مطالعہ مضمون ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اس مضمون میں رثائی ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس صنف میں ہونے والے کارناموں سے قارئین کو واقف کرانے کے ساتھ ساتھ واقعۂ کربلا کے عظیم سانحہ کو عصر حاضر میں سیاسی و سماجی نا انصافیوں کے خلاف ہر شاعر نے اپنے کلام میں استعارے کی صورت میں نمایاں کیا ہے، اسے پروفیسر شارب ردولوی نے جس طرح اجاگر کیا ہے وہ صنف مرثیہ کی اہمیت کے سامنے انسان کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی طرح پروفیسر علی احمد فاطمی نے مرثیے کی جمالیات کے حوالے سے مضمون لکھ کر مرثیہ کی وسعت و عظمت سے ہمیں واقف کرایا ہے۔ لئیق رضوی نے عوامی مرثیے میں ہندوستانیت کے عناصر کی جستجو کر کے مرثیے کی ایسی جہت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس سے رثائی شعراء اور ادباء قدیم روایات کی طرف ملتفت ہونے پر مجبور ہوں گے۔ عادل فراز نے جدید مرثیوں میں مزاحمتی رویئے کی جستجو میں جس قبیل سے کی ہے وہ مرثیہ نگاروں کے لئے خاصہ کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ نجم آفندی، مصور سبزواری اور افتخار عارف کے حوالے سے مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے مجموعۂ کلام 'مہر دونیم' سے واقعۂ کربلا سے متعلق اشعار کے حوالوں سے افتخار عارف کی شاعری کا محاکمہ جس انداز سے کیا ہے اس سے افتخار عارف کی رثائی شاعری سے واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ روشن تقی نے لکھنؤ کی عزائی و تہذیبی آثار میں لکھنؤ کے تہذیبی آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بعض نئی معلومات یکجا کی ہیں۔

نیا دور کے رثائی ادب میں لکھنؤ ہی نہیں دبستان رامپور کے بھی مرثیہ سلام گویوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ نثر کے ساتھ ساتھ شعری سرمایہ بھی کافی وقیع ہے نیز رسالہ کا سرورق لکھنؤ کی عزائی تہذیب و ثقافت کو بھی بخوبی نمایاں کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیا دور کے ایڈیٹر سید عاصم رضا اور ان کی ٹیم نے بڑی محنت اور لگن سے اس شمارے کو ترتیب دیا ہے۔ اس ادب نوازی کے لئے رسالہ نیا دور کے ایڈیٹر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ریحان حسن

گرونانک یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب

بڑی مسرت کی بات ہے کہ آپ جیسے مدیر کی نگرانی میں نیا دور کے تازہ شمارے میں جو نقش و نگار نظر آئے، ان کو دیکھ کر طمانیت حاصل ہوئی۔ ابن صفی پر جو گوشہ نومبر میں شائع ہوا ہے۔ وہ اس عظیم ادیب کے حوالے سے قارئین کو بہت کچھ بتاتا ہے۔ اسرار ناروی جو ابن صفی کے نام سے جاسوسی دنیا میں اپنی خداداد صلاحیت کے جوہر چمکانے کی بنا پر آج عالمی سطح پر روشنی کا ایک ایسا منارہ بن چکے ہیں کہ ان کے سارے ناقدین ادب کو اپنا سر تسلیم کرانے پر ہموار بنا گئے جو جاسوسی صنف کو کسی طرح ادبی درجہ دینے پر تیار نہیں تھے۔

یہی کمال فن ہے جو آفاقی قدروں سے مالا مال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن صفی نے اردو ادب میں اپنے فن پاروں سے جو اضافہ کیا ہے وہ عدیم المثال ہے۔

خاکسار کا یہ عقیدہ ہے ابھی موصوف کا مقام و مرتبہ پوری طرح متعین کرنے میں ہماری آنا کانی کام کر رہی ہے مگر حقیقت زیادہ دنوں تک چھپائی نہیں جا سکتی۔ ایک بار پھر آپ کو مبارکباد۔

اصغر یاسر

شری دھر شکلا مارگ، بہادر گنج (شاہجاں پور)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک کی موجودگی میں وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی ہندوستان کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی کا استقبال کرتے ہوئے (۱۶؍دسمبر ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی راج بھون میں آئی پی ایس ویک کے موقع پر (۲۷؍دسمبر ۲۰۱۸ء)

'جشن شارب' کے موقع پر سید عاصم رضا (ایڈیٹر نیا دور) جناب عارف نقوی (برلن) کو نیا دور کا خصوصی شمارہ انیس نمبر پیش کرتے ہوئے (۳؍دسمبر ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

وزیرداخلہ جناب راج ناتھ سنگھ کی موجودگی میں اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی
آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کی جینتی پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ ساتھ میں ہیں نائب وزیراعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما (۲۴ر دسمبر ۲۰۱۸ء)

ہندوستان کے وزیراعظم جناب نریندر مودی، اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک
اور وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی پریاگ راج میں دبیہ کمبھ اور بھویہ کنبھ کے افتتاح کے موقع پر (۱۶ر دسمبر ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب لکھنؤ کے سبھی A.H. Wheeler بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 73 अंक 08
दिसम्बर 2018
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, f'kf'kj] निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**